حصہ پنجم

بندگی (Faith)

اعتقاد ''FAITH''

Faith یا اعتقاد کے لفظی معنی بھروسے یا اعتبار کے ہیں۔ جب کسی بات یا کسی چیز پر بھروسہ کیا جاتا ہے تو یہ بھروسہ یا اعتبار اس چیز یا بات پر انحصار کا باعث بنتا ہے۔ یہ بھروسہ اور اعتبار ایک احساس یا سوچ کو جنم دیتا ہے۔ جسے ''Faith'' کہتے ہیں۔ کسی چیز، کسی بات یا پھر کسی انسان پر جتنا بھروسہ یا اعتبار زیادہ کیا جاتا ہے اس سے اس کی طاقت اور ہمت ظاہر ہوتی ہے۔ جس پر جتنا زیادہ انحصار کیا جائے وہ چیز اتنی ہی طاقتور محسوس ہوگی۔ یہ اعتقاد ہماری زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے اس کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہمیں کچھ اور پہلوؤں پر غور کرنا پڑے گا۔ مثلاً ''Faith'' لفظ کے ساتھ ہی کچھ سوال ہمارے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ مثلاً یہ ''Faith'' یا اعتقاد ہماری زندگی میں کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ کچھ لوگوں کے پاس کم اور کچھ لوگوں میں زیادہ کیسے ہے؟ جو لوگ اعتقاد رکھتے ہیں ان کی خوبیاں اور نشانیاں کیا ہیں؟ ہم ان کو کس طرح پہچان سکتے ہیں؟ ہم ''Faith'' کی طاقت کس طرح پیدا کر سکتے ہیں اور پھر کس طرح اپنی زندگی کو پرسکون اور آسان بنا سکتے ہیں؟

مسلمان ہونے کے ناطے ہم اللہ کی وحدانیت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ یقین اور اعتقاد ہمارے مذہب کی بنیاد ہے۔ اس کے ساتھ ہی خدا کے پیغمبروں کو ماننا، نبی پاک ﷺ کو آخری نبی ماننا، خدا کی کتابوں پر یقین کرنا اور قیامت و آخرت پر ایمان رکھنا ہمارے مذہب کے بنیادی عقائد ہیں اور کسی بھی ایسے شخص کو مسلمان قرار نہیں دیا جا سکتا جو اسلام کے ان بنیادی عقائد پر مکمل یقین نہ رکھتا ہو۔ اگر دیکھا جائے تو ہر مسلمان بظاہر ان سب عقائد پر یقین رکھتا ہے بلکہ ہر مسلمان بڑے شوق سے ماننے کو تیار ہوتا ہے کہ ان سب عقائد پر ہی اس کی زندگی کا دارومدار ہے۔ وہ زندگی جو ان عقائد پر منحصر ہوتی ہے وہ کچھ خاص نتائج ظاہر کرتی ہے جبکہ اگر ہم چاروں طرف نظر دوڑائیں تو صورتِ حال کچھ مختلف نظر آتی ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ اس اعتقاد کا صحیح مفہوم کیا ہے اور اس سے زندگی میں تبدیلی کیسے آتی ہے۔ توحید ہمارے مذہب کا بنیادی ستون ہے۔ یعنی جب تک ہم یہ تسلیم نہ کر لیں کہ خدا معبود برحق ہے اور اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہم مسلمان کہلانے کے حقدار نہیں ہو سکتے اور یہ حق ہم کسی صورت کھونا نہیں چاہتے۔ لہٰذا مسلمان ہونے کے ناطے ہم کبھی انکار نہیں کرتے۔ لیکن کیا صرف مسلمان کہلوانا کافی ہے یا پھر مسلمان بننا بھی ضروری ہے۔ صرف مسلمان کہلوانے کے لیے اللہ تعالیٰ کو سب سے بڑا اور طاقتور دنیا جہاں کا مالک سمجھنا کافی ہو سکتا ہے لیکن مسلمان بننے کے لیے ''Faith'' یعنی بھروسہ، اعتبار اور اس کی ذات پر انحصار کرنا پڑے گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج اگر

مسلمانوں کی حالت پر نظر ڈالیں تو کہنے کو مسلمان ہیں لیکن کردار اور اعمال کے لحاظ سے پستی کی آخری حدوں کو چھو رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو ایک عام مسلمان کلمہ توحید پڑھنے کی حد تک تو مسلمان کہلوانا چاہتا ہے لیکن جب طرزِ زندگی اختیار کرنے کی بات ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص پسند فرمائی ہے تو طرح طرح کے بہانے گھڑنے لگتا ہے۔ یہ کس طرح کا اعتقاد ہے؟ یہ سوال بھی ذہن میں آتا ہے کہ آیا اس طرزِ عمل کو اعتقاد کہنا بھی چاہیئے کہ نہیں؟ اس سلسلے میں ایک بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ ''Faith'' یا اعتقاد کی کوئی درمیانی صورت نہیں ہوتی یا ''Faith'' مکمل ہوتا ہے یا پھر نہیں ہوتا اس میں شک وشبہ کی گنجائش ہرگز نہیں ہے۔ اس کی مثال اس واقعہ سے لی جاسکتی ہے کہ ایک بزرگ اللہ تعالیٰ پر اعتقاد کا اظہار پانی پر چل کر کیا کرتے تھے۔ لوگ ان کو دیکھتے اور اس طرح ان کے ایمان کی طاقت بڑھتی تھی۔ ایک شخص ان کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ یہ آپ کیا کرتے ہیں۔ بزرگ نے اس بتایا کہ یہ اعتقاد اور ''Faith'' کی طاقت کا مظاہرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے انسان کچھ بھی کر سکتا ہے صرف اس کی رضا درکار ہے۔ وہ شخص بڑا متاثر ہوا اور کہنے لگا کہ خدا پر تو میرا بھی بڑا اعتقاد ہے تو کیا میں بھی اسی طرح پانی پر چل سکتا ہوں؟ بزرگ نے جواب دیا کہ کیوں نہیں اگر تمہارا ایمان ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا ہی تمہیں پار لگا سکتی ہے تو تم بھی پانی پر چل کر دیکھو۔ وہ شخص تیار ہو گیا لیکن جیسے ہی پاؤں پانی پر رکھنے لگا' ڈگمگا گیا اور اپنے ساتھی سے کہنے لگا کہ میری کمر کے ساتھ ایک رسی باندھ لو کیونکہ مجھے تیرنا نہیں آتا اگر کہیں درمیان میں گرنے لگوں تو بچا لینا بزرگ نے اسے روک دیا اور کہا کہ تیرنا تو مجھے بھی نہیں آتا تھا۔ لیکن اپنی صلاحیت کی بجائے میں نے خدا پر بھروسہ کیا۔ بس کچھ ایسا ہی ''Faith'' ہمارے چاروں طرف لوگوں کا ہے۔

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ جب کسی شخص نے نوکری کے لیے ''Interview'' دینے جانا ہوتا ہے تو اپنی ماں سے کہتا ہے کہ اللہ سے دعا کریں کہ نوکری مل جائے' باپ سے کہتا ہے کہ کوئی جان پہچان ہے تو ذرا فون کر دیں آج میرا ''Interview'' ہے' کیا یہ ''Faith'' ہے۔؟ ایک مثال پر غور کریں آپ کا دوست آپ کو فون کرتا ہے اور بڑے مان سے کہتا ہے کہ میں بڑی مشکل میں ہوں مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ ایک اچھا دوست ہونے کے ناطے آپ پریشان ہو جاتے ہیں اور ہر طرح سے مدد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن آپ کی ''Sincerity'' سے بے خبر آپ کا دوست آپ کی صلاحیتوں پر (doubt) کرتے ہوئے دوسرے لوگوں سے بھی مدد کے لیے کہتا ہے اور اس طرح اپنا کام نکال لیتا ہے اور جب آپ دوڑ دھوپ کر کے اس دوست تک پہنچتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ میرا کام تو فلاں نے کر دیا تھا تو آپ کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ یہی معاملہ انسانوں کے درمیان ہے۔ نہایت شرم کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارا رویہ تو ہمارے خدا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اگر ہمیں یقین ہو کہ خدا ہماری مدد کرے گا تو پھر ادھر ادھر ہاتھ

پاؤں کیوں مارتے ہیں۔کیا ہمارا ایمان یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر اس کائنات کا ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ہم یہ کیسے سوچ لیتے ہیں کہ نوکری مل جائے گی یا بزنس چل پڑے گا یا پھر زندگی کا کوئی بھی معاملہ ان قوانین سے بالاتر ہوگا جو اس کائنات کے بنانے والے نے نافذ کیے ہیں۔یہ غلط سوچ ہی ہماری پستی کا راز ہے۔اللہ تعالیٰ پر یقین کامل یعنی ''Faith'' ایک ایسی طاقت ہے جو انسان کو بلندیوں کی طرف لے جاتی ہے۔اس احساس یا سوچ وفکر سے عاری انسان کی مثال ایسے ہے جیسے وہ کھلے آسمان کے نیچے تپتی دھوپ میں بے سروسامان کھڑا ہے اور یہ بھی نہیں جانتا کہ مدد کہاں سے ملے گی۔ جب نبی پاک ﷺ سے پوچھا گیا کہ ''Faith'' کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''یہ یقین ہے جو دل کی گہرائیوں سے کیا جاتا ہے اور پھر ہر عمل سے اس کی تصدیق کی جاتی ہے۔'' اللہ تعالیٰ کو معبود برحق تسلیم کرنے کے ساتھ اس کی بنائی ہوئی ہر بات پر مکمل یقین کرنا جو اس نے بنائی ہیں ''Faith'' ہے۔عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف یقین کرنا کہ اللہ تعالیٰ واحد معبود ہے اور کوئی دوسرا عبادت کے لائق نہیں ہے مکمل ''Faith'' ہے۔نبی پاک ﷺ کی حدیث کے حوالے سے یہ احساس اور سوچ جسے ہم ''Faith'' کہتے ہیں ادھورا رہتا ہے۔ جب تک ہم اللہ کے آگے مکمل ہتھیار نہ ڈال دیں اور مکمل فرمانبرداری کا اظہار نہ کر دیں زندگی کے ہر چھوٹے اور بڑے معاملے میں خدا کا فرمان ہمارے لیے سب سے بڑھ کر اہمیت رکھتا ہو۔یہ جان لینے کے بعد ''Faith'' کیا ہے ہم یقیناً یہ جاننا چاہیں گے کہ یہ احساس یا سوچ کس طرح پیدا کیا جائے۔یعنی ایک مسلمان جو ''مسلمان گھرانے'' میں پیدا ہونے کی وجہ سے مسلمان تو بن گیا ہے اور اس طرح مسلمان کہلانے کا حق دار بھی ہے لیکن ''Faith'' کمزور ہونے کی وجہ سے مسلمان ہونے کا حق ادا نہیں کر پا رہا۔مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا اللہ پر پورا یقین ہے۔ہمارا دل اور دماغ اس حقیقت کی گواہی اور سوچ ہی اس ''Faith'' کی بنیاد ہے۔یہ بڑی حوصلہ افزا حقیقت ہے کہ ایک مسلمان کتنا ہی بھٹکا ہوا کیوں نہ ہو' اسلام کے بنیادی عقائد سے منحرف نہیں ہوتا۔لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس طرح کے ''Faith'' کا اس کی زندگی پر کوئی خاص مثبت اثر بھی ظاہر نہیں ہو رہا۔مسلمانوں کی گرتی ہوئی معاشی' علمی' اخلاقی اور سماجی حالت اس کی بہترین مثال ہے۔

ہمارے معاشرے کے 99% لوگ ''Faith'' جیسی نعمت سے محروم ہیں۔جب ایک بچہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوتا ہے بنیادی طور پر مسلمان ہوتا ہے۔جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا ہے اردگرد کے ماحول سے اس کی سوچ کی تعمیر ہوتی ہے۔اگر خوش قسمتی سے وہ ایسے گھرانے میں پیدا ہوا ہو۔جن کا طرزِ زندگی صحیح اسلامی اصولوں پر قائم ہو تو اس کے لیے آسانی ہوگی جبکہ حقیقت میں ایسے گھرانے ہمارے معاشرے میں اتنے ہی ہیں جو انگلیوں پر گنے جا سکیں۔

Faith کے بغیر ہمارا معاشرہ ان تمام برائیوں سے کبھی بھی نہیں پاک ہو سکتا۔جو ہماری صلاحیتوں کو گھن کی

طرح کھا گئیں ہیں اور ہم لگاتار تباہی کے گڑھے کی طرف بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ ہمارے چاروں طرف ایسے لوگ کام کر رہے ہیں جو ''Faith'' نہ ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہمارے ہاں کردار کا فقدان ہے۔ ''Faith'' کے بغیر کردار ناممکن ہے آپ لوگوں کے لیے کچھ بھی کر لیں جو لوگ خوف خدا نہیں رکھتے ان کی زندگی کے ہر معاملے سے بے خوفی کا اظہار ہوتا ہے۔ جس انسان کو خدا کا ڈر نہ ہو اسے برائی سے کیسے روک سکتے ہیں۔ یہاں پر یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ پھر دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ برائی سے کیسے بچتے ہیں۔ دراصل مذہب چاہے کوئی بھی ہو اس میں سب سے اوپر ایک خدا ہی ہوتا ہے جو بے پناہ طاقت کا مالک ہے، جس نے انسان کو اچھے برے کی تمیز دی اور جو لوگ خدا پر ایمان نہیں بھی رکھتے لیکن ان کا ایمان اچھائی پر ہوتا ہے لہٰذا وہ باکردار لوگ ہوتے ہیں۔ بحیثیت مسلمان ہمارا یہ حال ہے کہ خدا پر تو ایمان ہے لیکن سمجھتے یہ ہیں کہ بس خدا معاف کر دے گا یعنی ہمیں یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ خدا مہربان ہے لیکن اعمال کے حساب کا ہمیں یقین نہیں ہے۔ جبکہ مسلمان ہونے کے ناطے جن عقائد پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اُن میں یہ بھی شامل ہے کہ لوگ صرف نیک اعمال کے ذریعے ہی بخشے جائیں گے۔ مسلمان ہونے کے ناطے اگر ہمارا یہ ایمان ہے کہ خدا ہر وقت دیکھتا ہے اور ہر عمل کا حساب چاہے وہ رتی برابر کیوں نہ ہو لیا جائے گا تو ''Faith'' رکھنے والا مسلمان آدھی رات کو بھی ٹریفک کا کوئی قانون نہیں توڑے گا اور یہی کردار کی نشانی ہے۔ ''Faith'' رکھنے والوں کی نشانی یہی ہے کہ وہ باکردار ہوتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنے کام نکلوانے کے لیے سفارشوں کے سہارے لیتے ہیں یا پھر تعویز گنڈوں یا مزاروں کے چکروں میں پڑے رہتے ہیں۔ انہیں یہ علم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وہ اس طرح کے ہتھ کنڈوں سے خوش تو نہیں کر سکتے بلکہ اس کے غصے اور عذاب کا شکار بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان خدا کے غضب و غصہ کی لپیٹ میں ہر وقت رہتے ہیں۔ کیونکہ ''Faith'' کے بعد نافرمانی کے بارے میں قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> '' جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے، وہ نہیں جو مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو بلکہ وہ جو دل کھول کر کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب اور ان کو بڑا سخت عذاب ہوگا۔ '' (16: 106)

ایک مسلمان کے ''Faith'' کی مثال تو حضرت ابراہیمؑ جیسی ہونی چاہیئے۔ جو خدا پر بھروسہ کر کے آگ میں سے بھی گزرنے سے گریز نہ کرے یا پھر اولاد کی قربانی درکار ہو تو ماتھے پر ایک شکن، نہ آنکھ میں ایک آنسو آنے دے اور اپنے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ایک دوسرے سے بڑھ کر ''Faith'' کا مظاہرہ کریں۔ جب نبیوں اور پیغمبروں کی مثال دی جائے تو لوگ کہتے ہیں کہ وہ تو خاص لوگ تھے ہمارا ان سے کیا مقابلہ! جسے قرآن پاک کی سچائی پر یقین ہوا

سے معلوم ہونا چاہیئے کہ ان لوگوں کی مثالیں کچھ سکھانے کے لیے دی گئیں ہیں۔قرآن مجید کوئی کہاوتوں کی کتاب نہیں ہے بلکہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس کے اندر عقل والوں کے لیے نصیحت ہے۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ایک مسلمان کے لیے ''Faith'' کے معنی کیا ہیں اور اس کا ہماری طرزِ زندگی پر کیا اثر ہوتا ہے۔آیئے اب یہ دیکھتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی میں کس طرح ''Faith'' کی طاقت کو بڑھا سکتے ہیں۔''Faith'' ایک ایسی قوت ہے جسے ہم صرف محسوس کر سکتے ہیں لیکن اس کے نتائج بہت ٹھوس اور واضح ہوتے ہیں۔یہ ایک احساس ہے جو ہمیں اللہ تعالیٰ پر ہمارے ایمان کو مضبوط کرتا ہے۔ وہ کام کرنے سے جن سے ایمان کی قوت بڑھے ''Faith'' کو مضبوط کرتے ہیں۔مثلاً معاف کرنا ایک ایسا عمل ہے جو آپ کو خدا کے قریب لاتا ہے اور اس طرح ''Faith'' مضبوط ہوتا ہے۔

اسی طرح ہر وہ عمل جس سے آپ اپنے آپ کو خدا کے قریب محسوس کرتے ہیں ''Faith'' کی مضبوطی کا باعث بنتا ہے۔جس انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے جتنا مضبوط ہوگا اس کا ''Faith'' اتنا ہی مضبوط ہوگا۔اللہ تعالیٰ سے تعلق کو اس مثال سے سمجھ سکتے ہیں کہ جیسے آپ کا کوئی دوست ہو جو مشکل وقت میں ہمیشہ آپ کا ساتھ دیتا ہو اور آپ کو یقین ہے کہ وہ آپ کو دھوکہ نہیں دے گا' آپ کی عزت کرے گا اور آپ کا مان رکھے گا اور خواہ کیسی ہی صورت حال کیوں نہ ہو آپ پر کسی اور کو ترجیح نہیں دے گا۔صرف اسے ہی آپ اپنے راز بتائیں گے۔بالکل اسی طرح جب کسی کا تعلق اللہ تعالیٰ سے گہرا ہوتا ہے تو اسے بہت سے ایسے سوالوں کا جواب خود بخود بڑی آسانی سے مل جاتا ہے جو ایک عام انسان (جو اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا ہے) سمجھ نہیں پاتا۔یعنی ''Faith'' مضبوط کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے قریبی تعلق بہت ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کیسے کیا جائے یہ رہنمائی قرآن پاک اور نبی پاک ﷺ کی سنت سے ملتی ہے۔

☆ _____ ☆

دورِ جہالت

اللہ تعالیٰ نے جب پہلا انسان اس دنیا میں بھیجا تو اسے پیغمبر بنا کر بھیجا۔ حضرت آدمؑ کو پہلا انسان اور ساتھ ہی پیغمبر بنا کر بھیجنے کا مقصد ہی انسانیت کی بنیاد ایک خاص دستور پر رکھنا تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو شعور دیا اور پھر اسے آزادی دے دی کہ اپنا اچھا برا سوچ سکے اور اس کے لیے جزاء وسزا کا وعدہ کیا اور گاہے بگاہے اس کی ہدایت کے لیے پیغمبر اور رسول بھیجے اور آسمانی کتابیں اتاریں۔ کیونکہ وہ انسان کی خصلت سے واقف ہے اور کیوں نہ ہو وہی معبودِ اعلیٰ تو اس انسان کو تخلیق کرنے والا ہے۔ جب بھی انسان کو ضرورت پڑی تو اللہ تعالیٰ نے کسی نہ کسی صورت میں ہدایت بھیجی۔ جس کی عقل میں بات آتی گئی وہ کامیاب ہوتے گئے اس طرح اس دنیا کا نظام چلتا رہا ہے۔ ہمارے نبی پاک ﷺ کا دور جو کہ حضرت عیسیٰؑ کے چھ سو سال بعد کا ہے دورِ جہالت کے اس دور سے گزر رہا تھا کہ جہاں اسے ہدایت کی اشد ضرورت تھی۔ اگر آج ہم اپنے اردگرد نظر دوڑائیں تو کچھ ایسی ہی صورت حال نظر آتی ہے۔ آج یہ موازنہ کرتے ہیں کہ کیا وہ وقت زمانہ جہالت کہلانے کا زیادہ حقدار تھا یا پھر آج جو کچھ ہو رہا ہے یہ اصل زمانہ جہالت کی نشانیاں ہیں اور ہم کہیں زیادہ جاہل کہلانے کے حقدار ہیں۔

گھر کی چھوٹی سی ہی دنیا کو لے لیں ہر گھر کا ایک طریقہ کار ہوتا ہے جو زیادہ تر آباؤ اجداد سے چلا آتا ہے۔ جب اسی گھر کے افراد میں سے کوئی ایک شخص کسی خاص انداز سے سوچنے لگے یا پھر معمول سے ہٹ کر کوئی بات کر دے تو سارا خاندان اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ آج ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کوئی ایک یا دو باتیں ایسی نہیں ہیں جو ہم غلط کر رہے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ صبح سے شام تک ہم ایک یا دو کام ٹھیک کرتے ہوں گے باقی سب غلط کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کا ثبوت ہمارے معاشرے کی اخلاقی، معاشی، معاشرتی، جسمانی، ذہنی اور روحانی تباہی ہے۔ اب اس طرح کے ماحول میں شاید کوئی خوش قسمتی سے صحیح راہ پر چل پڑے تو اس کا راستہ تو یقیناً سب سے الگ ہی رہے گا۔ اسی طرح کے لوگوں کو ہمارا معاشرہ مکمل طور پر رد کر دیتا ہے اور اپنے ہی گھر میں ایک انسان کی حیثیت ایک مجرم کی سی ہو جاتی ہے۔ ہر انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو برائی سے پاک ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر اپنی روح پھونک کر ہمیں زندگی عطا کی ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک کے الفاظ ہیں۔

" اور جب میں (اللہ تعالیٰ) نے اسے بنا لیا تو اس میں اپنی روح پھونک دی۔ " (15: 29)

ہر انسان کا اصل تو اس کی روح ہے۔ یہ جسم تو ایک لبادہ ہے جو یہ دنیا میں وقت گزارنے کے لیے ہمیں ملا

ہے۔اس روح کی آواز ضمیر کہلاتی ہے۔ضمیر انسان کو اچھے برے کی تمیز کراتا ہے۔انسان کی تخلیق ہی اچھے کاموں کے لیے ہوئی ہے۔جو لوگ ضمیر کی آواز نہ سننے کی عادت ڈال لیتے ہیں انہیں پھر برائی سے روکنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔یہ لوگ صرف وہ سنتے اور جانتے ہیں جو اردگرد نظر آتا ہے ہم اسی بنیاد پر اپنے لیے اچھے برے عمل کا انتخاب کرتے ہیں۔

اگر ہم اپنے اردگرد نظر دوڑائیں تو اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہمارے معاشرے میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے۔جب اس بے ضمیر انسانوں کی دنیا میں کہیں کوئی باضمیر انسان مل بھی جائے تو لوگ اسے کہاں قبول کریں گے۔جو باضمیر لوگ ہیں وہ صحیح راہ پر چلنے سے ڈرتے رہتے ہیں کیونکہ ہمارے معاشرے میں ان کا جینا حرام کر دیا جاتا ہے۔انہیں طرح طرح کے القاب مثلاً قدامت پسند، جاہل یا پھر پینڈو کے خطاب سے نوازا جاتا ہے یا ہمارے معاشرے میں باضمیر ہونے کی سزا اتنی سخت کر دی گئی ہے جو کم ہی لوگ سہہ پاتے ہیں۔ اگر ہم اسلام کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو عرب میں صورت حال کچھ ایسی ہی تھی۔اس کائنات کا سب سے بڑا سچ کوئی ماننے کو تیار نہیں تھا۔وجہ یہ نہیں تھی کہ کوئی ایسی ان ہونی بات تھی جو سن کر لوگ حیران ہو جائیں یا عام انسان کی سمجھ سے یہ حقیقت بالاتر ہو، ہرگز نہیں۔تاریخ گواہ ہے کہ پورا عرب اس حقیقت سے اتفاق کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے نبیوں کی طرح نبی پاک ﷺ پر کتاب نازل کی ہے۔انہیں رسول اللہ ﷺ کے سچے ہونے پر یقین تھا لیکن انہیں یہ سب پسند نہیں تھا۔ابوجہل سے بڑھ کر نبی پاک ﷺ کا کوئی دشمن نہیں تھا۔اس نے بھی آپ ﷺ سے ایک بار کہا ''محمد ﷺ میں آپ ﷺ کو جھوٹا نہیں کہتا لیکن جو کچھ آپ ﷺ فرماتے ہیں میں اس کو ٹھیک نہیں سمجھتا۔جب نبی پاک ﷺ کو حکم ملا کہ اعلانیہ طور پر لوگوں کو پیغام پہنچاؤ تو آپ ﷺ ایک پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے اور اعلان کیا۔انہوں نے قریش کو مخاطب کر کے فرمایا کہ'' اگر میں کہوں کہ پہاڑ کے دوسری طرف سے دشمن حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم میری بات مانو گے۔'' جواب کچھ ایسے تھا ''کیوں نہیں ہم نے آپ ﷺ کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں سنا۔'' اتنا یقین ہونے کے باوجود وہ اسلام کی تعلیمات سے منحرف تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں یہ گمان تھا کہ آخر نبوت کے لیے ان کے (elite) اونچے طبقے میں سے کوئی امیر زادہ کیوں نہیں لیا گیا یا پھر نبوت میں اس اونچے طبقے کا حصہ کیوں نہیں ہے۔جیسے ہی نبی پاک ﷺ نے نبوت اور رسالت کا اعلان کیا قریش جو کہ عرب کا مغرور قبیلہ تھا اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ رسالت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو مکمل طور پر رسالت کے حوالے کر دیا جائے اور اس طرح اپنی جان اور مال کے بارے میں کوئی اختیار نہ رہے۔اس کے معنی یہ تھے کہ مکہ والوں کو دینی رنگ میں باقی عرب پر جو بڑائی اور سرداری حاصل تھی کہیں وہ بھی نہ جاتی رہے۔اللہ اور رسول ﷺ کی مرضی کے مقابل میں انہیں اپنی مرضی پر عمل پیرا ہونے کا اختیار نہ رہے۔اس

کے ساتھ ساتھ نچلے طبقوں پر جو رعب و دبدبہ ہے کہیں وہ بھی نہ جاتا رہے اور صبح و شام جن برائیوں میں پڑے رہتے ہیں وہ چھوڑنی نہ پڑ جائیں۔ اس حقیقت کو قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے کچھ اس طرح بیان فرمایا ہے کہ:

"بلکہ اس لیے انسان چاہتا کہ آئندہ بھی برائی کرے۔" (75: 5)

اب غور کریں! کیا آج ہمارا معاشرہ بھی کچھ ایسی ہی صورت حال کا شکار نہیں ہے؟ صحیح مسلمانوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ مجموعی طور پر اپنے آپ کو کمزور محسوس کرتے ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر اپنا محاسبہ تو کرتے ہیں لیکن برائی ہوتی دیکھ کر خاموش رہتے ہیں جو کہ ایمان کے کمزور ہونے کی نشانی ہے۔ انسان خسارے سے تبھی نکل سکتا ہے جب وہ نہ صرف خود ایمان لائے بلکہ حق وصبر کی تلقین بھی کرے۔

"عصر کی قسم! بیشک انسان خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق بات کی تاکید اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔"

(103: 1-3)

کیونکہ ہمارا دین انفرادی فلاح و بہبود کے لیے نہیں بلکہ اجتماعی ترقی کو اہمیت دیتا ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری آنے والی نسلیں اس دین پر قائم رہیں تو ہمیں یہ پیغام پھیلانے کے لیے قربانیاں دینا ہی پڑیں گی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے نبی پاک ﷺ کے ساتھ نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ ہمارے پاس دین کو ہاتھ سے جانے دینے کی گنجائش نہیں ہے۔ نہیں تو ہمیں اللہ کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکے گا جبکہ صورتِ حال کچھ ایسی ہے کہ آج ہمارا معاشرہ برائی کا عادی ہو چکا ہے یہاں تک کہ برائی کرنے سے پہلے نہ سوچنا پڑتا ہے نہ ڈر لگتا ہے۔ اس کے برعکس کوئی کام ٹھیک کرنے سے پہلے طرح طرح کے خوف اور ڈر کا سامنا کرنا پڑتا ہے مثلاً اگر ٹریفک کا اشارہ توڑ کر نکلنا پڑے تو کوئی بات نہیں بلکہ یہ تو بڑی بہادری کا کام ہے کیونکہ سڑکوں پر زیادہ تر ایسے کام وہی لوگ کرتے ہیں جن کے رشتے دار اونچے اونچے عہدوں پر لگے ہوتے ہیں۔ سپاہی بھی انہیں قانون کی خلاف ورزی سے نہیں روکے گا۔ اس کے علاوہ اگر گاڑی زیبرہ کراسنگ سے پیچھے کھڑی کر دیں تو پیچھے آنے والی ساری گاڑیاں آپ کو پاگل قرار دے کر نہ صرف ہارن بجانا شروع کر دیں گی بلکہ آپ کو چاروں طرف سے گالیاں اور طرح طرح کے (Remarks) سننے کو ملیں گے۔ اسی طرح اگر بازار میں سودا سلف لینے جائیں تو نماز کا وقت ہو جائے تو احساس ہوگا کہ آپ کے لیے نماز پڑھنا جو کہ ہمارے مذہب کا بنیادی ستون اور پہلا فریضہ ہے مشکل ترین کام بن جائے گا نہ کوئی وضو کی جگہ ملے گی۔ مسجدیں اگر ہیں تو وہاں عورتوں اور بچوں کے لیے داخلہ پر پابندی ہوگی۔ اگر آپ کسی سے درخواست کریں کہ نماز کے لیے تھوڑی سی جگہ دے دیں تو لوگ آپ کی طرف ایسے دیکھیں گے جیسے آپ نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔ اس کے برعکس لوگ

اپنی برائیوں کا فخر سے پرچار کرتے ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں اونچے طبقے میں عورتوں کا بازاری عورتوں کی طرح نمائش کرنا' چھوٹے بچوں کو گھروں میں نوکر رکھنا' اسلام کا مذاق اڑانا' رشوت لینا اور دینا (تحفے تحائف کی شکل میں) سود کھانا اور لڑکے لڑکیوں کا غیر شرعی تعلقات رکھنا' پورے طم وطراق سے نہ صرف رائج ہے بلکہ (elite) ہونے کی یہی علامات ہیں اگر آپ یہ سب یا پھر ان میں سے کچھ بھی نہیں کرتے تو آپ کا شمار ہمارے معاشرے کے شرفا میں نہیں ہو سکتا۔

غور کریں کیا ہم سے بڑھ کر جاہل کہلانے کا کوئی اور حق دار ہو سکتا ہے شاید نہیں!

یہ تو ان حالات کا جائزہ تھا جو آج کے معاشرے میں اچھے کام نہ کرنے کے سلسلے میں انفرادی طور پر برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ ہم نے اپنے مذہب یعنی اسلام کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور اس سلسلے میں دورِ جہالت کو کیسے مات کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

نبی پاک ﷺ کی نبوت سے پہلے عام باشندگان عرب حضرت اسماعیلؑ کی دعوت وتبلیغ کے نتیجے میں دین ابراہیمی کے پیروکار تھے۔ اس لیے صرف اللہ کی عبادت کرتے تھے اور توحید پر کاربند تھے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے خدائی درس ونصیحت کا ایک حصہ بھلا دیا اور مذہب کی شکل بگڑنا شروع ہوگئی۔ یہاں تک بنو فزاعہ کا سردار عمر بن لحی منظر عام پر آیا اور اس نے نیکوکاری' صدقہ خیرات اور دینی امور سے گہری دلچسپی کی بنا پر لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ پھر اس شخص نے ملک شام کا سفر کیا دیکھا وہاں بتـــــوں کی پوجا کی جا رہی تھی اس نے سمجھا کہ یہ بھی برحق ہے کیونکہ ملک شام پیغمبروں کی سرزمین اور آسمانی کتابوں کی نزول گاہ تھی۔ چنانچہ وہ اپنے ساتھ ہبل بت لے آیا اور اس نے خانہ کعبہ کے اندر نصب کرا دیا اور اس طرح خدائی عبادت بتـــوں کے سامنے ہونے لگی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تبدیلی آئی کہ لوگ اللہ کو بھول گئے اور جو سامنے نظر آتا تھا یعنی بت اسے ہی خدا مان بیٹھتے۔ نبی پاک ﷺ کی نبوت سے پہلے یہ عام تھا کہ ہر قبیلے کا ایک بت اور ہر گھر میں ایک بت نصب ہو چکا تھا۔ جبکہ کہنے کو یہ لوگ دین ابراہیمی کے پیروکار تھے اور حقیقت میں اس حیثیت پر بڑا گھمنڈ بھی کرتے تھے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ اہل جاہلیت کے اندر رائج بت پرستی کے چند اہم مراسم کیا تھے؟ حاجت روائی اور مشکل کشائی کے وقت ان سے التجا اور فریاد کرتے تھے' بتـــوں کا طواف کرتے تھے' ان کے سامنے عجز و نیاز سے پیش آتے اور انہیں سجدہ کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ وہ اللہ سے سفارش کر کے ہماری مرادیں پوری کر دیں گے۔ بتـــوں کے لیے نذرانے اور قربانیاں پیش کرتے تھے۔ عرب والے اپنے بچوں کے ساتھ یہ سب کچھ اس عقیدت کے ساتھ کرتے تھے کہ یہ بت انہیں اللہ کے قریب کر دیں گے۔ اس لیے قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

" (مشرکین) یہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ محض وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کردیں گے۔" (39: 2)

غور کریں آج ہمارے ہاں مزاروں پر کیا ہوتا ہے۔ بتوں کی صرف شکل بدل دی گئی ہے جبکہ بت بھی مٹی سے بنے ہیں اور انسانی ہاتھوں کی ایجاد ہے اور قبر بھی چاہے کسی بزرگ کی ہی کیوں نہ ہو جس طریقہ شرک کو ختم کرنے کے لیے اسلام آیا وہی آج ہمارے ہاں رائج ہی نہیں بلکہ اس حد تک عام مقبول ہے کہ اس کے خلاف آواز اٹھانے والا کافر قرار دیا جاتا ہے اور اسی ڈر سے اس گناہ کبیرہ کے خلاف آج تک کسی نے آواز نہیں اٹھائی۔ جو اس شرک کے خلاف اٹھ کھڑا ہوگا اس کے ساتھ ہمارا معاشرہ یہی سلوک کرے گا۔ جو بت توڑنے پر حضرت ابراہیمؑ سے کیا گیا اور پھر نسل ابراہیمؑ تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ نبی پاک ﷺ نے خود اپنے ہاتھوں سے خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کو ایک ایک کر کے توڑ نہیں ڈالا۔ مشرکین کا یہ فعل ہمیں بہت برا لگتا ہے کہ انہوں نے بتوں کو پوجا۔ یہ نبوت رسول ﷺ سے پہلے کی بات ہے اب تو دین مکمل ہوئے بھی 1400 سال سے زائد ہو گئے اور جو ہدایت مسلمانوں کو نصیب ہوئی وہ تو کائنات میں کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی تو انصاف کیجئے مشرکین مکہ زیادہ جاہل تھے یا پھر ہم ان سے بھی بازی لے گئے ہیں۔

دورِ جہالت میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ آج لڑکیوں کی شادی کر کے زندہ دفنایا جاتا ہے۔ شادی کے وقت ماں باپ لڑکی کو کہہ دیتے ہیں اور یہ نصیحت کرتے ہیں کہ اب تمہارا جینا مرنا سسرال میں ہی ہے۔ یعنی ہمارے گھر کے دروازے تمہارے لیے بند ہو گئے ہیں جبکہ نہ لڑکی کی دینی تربیت کی گئی ہو اور صرف دنیاوی اتار چڑھاؤ سیکھا کر اور جہیز کا رعب جما کر گائے بکری کی طرح اس کی رسی دوسروں کے ہاتھوں میں تھما دی جاتی ہے کہ یہ ہماری طرف سے قربانی کا جانور ہے۔ اس کے ساتھ جو چاہے کرو۔ بالکل اسی طرح دور جاہلیت میں لڑکیوں کی منڈیاں لگتیں اور ان کا جانوروں کی طرح سودا کیا جاتا تھا۔ عورت کو قربانی کا جانور یا پھر استعمال کی چیز کے طور پر لیا جاتا تھا۔ نہ اس کا کوئی جائیداد میں حصہ ہوتا تھا نہ اپنی زندگی پر اس کا کوئی حق تھا۔ دورِ جہالت میں نکاح کے چار طریقے رائج تھے جن میں سے ایک طریقہ وہی تھا جو آج بھی قائم ہے یعنی ایک آدمی دوسرے آدمی کو اس کی زیر پرستی لڑکی کے لیے پیغام بھیجتا ہے پھر منظوری کے بعد حق مہر دے کر اس سے نکاح کر لیتا ہے۔

باقی تین طریقے اس وقت کے انسان کی گری ہوئی حالت کا نمونہ پیش کرتے ہیں جب اسلام کا نظام رائج ہوا تو صرف ایک طریقہ جائز قرار پایا۔ اب آج کے دور کا جائزہ لیں ہمارے معاشرے میں شادی کا سب سے بہتر طریقہ وہ سمجھا جاتا ہے جس میں لڑکے لڑکی کی مرضی سے پہلے خاندان دیکھے جاتے ہیں۔ اگر کوئی لڑکا یا لڑکی کسی سے پسندیدگی کا

اظہار کریں تو ان کا کردار معاشرے میں زیرِ عتاب آ جاتا ہے۔ حالانکہ نبی پاک ﷺ کا پہلا نکاح خود حضرت خدیجہؓ کی مرضی سے ہوا۔ اس کے بعد آپ ﷺ کے جتنے نکاح ہوئے وہ اللہ کے حکم سے ہوئے ان میں خاص مصلحتیں پوشیدہ تھیں۔ ایک طرف عرب معاشرہ عورتوں کی تذلیل میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا تو دوسری طرف صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔ نہ صرف گھر اور خاندانوں میں بلکہ جنگوں کے فیصلوں اور بڑے اہم مواقع پر بھی مرد حضرات عورتوں کے اشاروں پر ناچتے نظر آتے تھے۔ بالکل یہی صورتِ حال آج بھی دیکھنے میں آتی ہے ایک طرف عورت مظلوم ہے تو دوسری طرف عورتوں نے معاشرے کی باگ دوڑ اپنے ہاتھوں میں لی ہوئی ہے۔ جبکہ نمود و نمائش، رسوم و رواج اور مقابلہ بازی تو عورتوں کا ہی جینا مرنا ہے۔ شریف آدمی کی پہچان ہی یہ بن گئی ہے کہ وہ زبان کھولتا ہی نہیں بلکہ اپنے اردگرد کے ماحول کو دیکھ کر اور سب کچھ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی اندھا، بہرہ اور گونگا بن جاتا ہے۔ کیونکہ وہ معاشرے کے اچھے برے اصولوں میں اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ ہمارے ملک کی پچاس سالہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ حکمرانوں نے کن کن عورتوں کے اشاروں پر ملک کے ٹکڑے کر ڈالے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

دورِ جہالت میں ناچنے گانے کا رواج عام تھا۔ ہر گھر میں یہ عام دستور تھا کہ محفل لگے تو ناچ گانے کی۔ آج بھی یہی صورتِ حال ہے جہاں ناچ گانہ نہیں بھی تھا تو وہاں پر TV اور ڈش نے کسر پوری کر دی۔ چھوٹے چھوٹے بچے گنگناتے نظر آتے ہیں۔ شادیوں اور محفلوں میں ناچنے والی بچیاں بااعتماد، پرجوش اور بڑی قابل سمجھی جاتی ہیں۔ سب سے بڑے پرائیویٹ سکولوں میں ناچنے کی تربیت دینا بنیادی نصاب کا حصہ ہے۔ اس دور کو ''دورِ جہالت'' سے قریب تر لانے کی کسر ہمارے طرزِ فکر نے پوری کر دی ہے مشرکین مکہ کو جتنی ہدایت کی ضرورت تھی اتنے ہی وہ اپنے طریقوں پر فخر کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح آج بھی ہدایت کی جس شدت سے ضرورت ہے ہمارا معاشرہ اسلام کے نظام سے اتنی ہی نفرت اور بے راہ روی کا شکار ہے اور اس کا اظہار کرتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں تبدیلی کی بڑی رکاوٹ بالکل وہی ہے جو دورِ جہالت میں تھی یعنی جب آپ کسی کو کچھ سمجھانے کی کوشش کریں تو سب سے پہلا جواب یہی ہوتا ہے کہ کیا کریں جی بڑے نہیں مانتے یا پھر ہمارے خاندان میں یہی رواج ہے۔ جب اسلام آیا تو نبی پاک ﷺ نے بتوں کی پوجا سے روکا تو اہل مکہ کا بھی جواب تھا کہ کیا ہم اپنے آباؤ اجداد کے طور طریقے چھوڑ دیں جو ہم صدیوں سے کرتے آئے ہیں، خود فیصلہ کیجئے!

اگر ہماری وہی سوچ ہے جو اہلِ مکہ کی 1500 سو سال پہلے تھی تو ان میں اور ہم میں کیا فرق ہے؟ غالباً کچھ بھی نہیں ہے۔ آج ہم اسی اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں جس سے نکالنے کے لیے ہی اسلام کی روشنی بھیجی گئی تھی۔ وہی غلط فہمیاں اور خوش فہمیاں جو اہلِ مکہ کو لے ڈوبیں ہمیں بھی تباہی کے کنارے تک لے آئیں ہیں۔ ہمارا معاشرہ تباہی

کے اس دور سے گزر رہا ہے جو کسی بھی طرح دورِ جہالت سے کچھ بھی کم کہلانے کا حقدار نہیں ہے اور اگر ساری دنیا ہمیں جاہل قوم کے طور پر جانتی ہے تو ہمیں بہت برا لگتا ہے۔ کاش ہم جاہل نہ ہوتے اور نہ ہی جاہل کہلائے جاتے۔

☆ _____ ☆

خدا نظر کیوں نہیں آتا؟

آج کا دور سائنس کا دور ہے چاروں طرف نظر دوڑائیں تو ہماری زندگیوں پر سائنس کے کارناموں کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ بچہ جب ہوش سنبھالتا ہے ماں کی گود کی بجائے اپنے آپ کو سائنس کی دنیا میں پاتا ہے جہاں سے اس کی ذہنی نشو ونما شروع ہوتی ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا ہے اس کا دماغ اسی طرح ''Train'' ہو جاتا ہے کہ اسے ہر بات کا ثبوت' دلائل اور ''Logic'' کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح کے ماحول میں رہ کر عین ممکن ہے کہ ہر بچہ مذہب اور اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کرنا چاہے اور اگر بڑوں کے پاس اس طرح کے سوالات کا کوئی مناسب جواب نہ ہو تو بچہ ذہنی طور پر غیر یقینی صورتِ حال کا شکار رہے گا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگر کوئی بچہ الٹے سیدھے سوالات کرے اور اگر اسے ڈانٹ دیا جائے تو پھر وہ اس طرح کے سوالات دوبارہ نہیں کرے گا۔ بلکہ کوئی اور سوال بھی اس کے ذہن میں آئے تو بھی وہ ڈانٹ کے ڈر سے پوچھے گا ہی نہیں اور جب یہ بچہ بڑا ہو جائے گا تو شرم سے سوال نہیں پوچھے گا کیونکہ ڈانٹ تو شاید نہ پڑے لیکن اگر سوال الٹا سیدھا ہوا تو لوگ ہنسیں گے ضرور..... لہٰذا وہ بچہ بڑا ہو کر بھی غیر یقینی صورت حال کا شکار رہے گا اور پھر آہستہ آہستہ تجربے کی بنا پر زندگی کے آخری حصے تک پہنچنے پر شاید اسے اس کے سوالوں کا جواب مل جائے۔ غور کریں جب یہ عمل صدیوں تک جاری رہے تو لوگوں کی ذہنی حالت کیا ہو چکی ہوگی۔ کیا ایک غیر یقینی صورت حال کے شکار انسان کی ذہنی کیفیت ایسی ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے بڑے بڑے فیصلے صحیح طور پر کرنے کے قابل ہو؟ ہرگز نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے مذہب میں اس بات سے روکا گیا ہے کہ ان چیزوں کے پیچھے نہ پڑا جائے جنہیں اللہ تعالیٰ نے کسی خاص مصلحت کے تحت خفیہ رکھا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان کو سوال کرنے سے روکا گیا ہے۔ سوال کرنا تو انسان کی دماغی نشو ونما کی پہلی سیڑھی ہے۔ اسلام چونکہ آیا ہی انسان کی نشو ونما کے لیے تھا اس لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ سوال کرنے کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ جن سوالوں کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے وہ ہماری زندگیوں پر کچھ زیادہ اثر انداز نہیں ہوتے۔ مثلاً ''جنت کیسی ہوگی؟'' ایک اچھے مسلمان کے لیے تو جنت کی حقیقت اتنی ہی کافی ہے جتنا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بتایا یا نبی پاک ﷺ نے واضح کر دیا۔ اس کے برعکس اکثر سوالوں کے جواب انسان کے ذہن کی تسلی کے لیے ضروری بھی ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں طرح طرح کے سوال ہر انسان کے ذہن میں آتے ہیں۔ سب سے بڑا اور اہم سوال جو یہ مضمون لکھنے کی وجہ بھی ہے وہ یہ کہ ''اللہ نظر کیوں نہیں آتا؟'' وہ حقیقت جس کا ہماری زندگی پر اتنا گہرا

اثر ہے کہ جس کے بغیر ہم ایک سانس بھی نہیں لے سکتے۔ ''واضح کیوں نہیں ہے'' یا پھر ہم میں کوئی کمی ہے جو ہم اسے دیکھ نہیں پاتے۔

آیئے اس سوال کا جواب ڈھونڈتے ہیں۔اس سوال کا جواب ڈھونڈنے سے پہلے کچھ چیزوں کو ذہن میں رکھنا پڑے گا۔جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا کہ سائنس کا ہماری زندگیوں پر گہرا اثر ہے اور جہاں تک انسان کا دماغ اور عقل کام کرتے ہیں' سائنس ہر بات کا جواب مہیا کرتی ہے۔لیکن یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ سائنس ایک عمل ہے جو مسلسل تبدیلی کا شکار ہے۔مثلاً آج ایک مفروضہ کسی چیز کو صحت کے لیے اچھا قرار دیتا ہے تو کل اسی چیز کو تجربے کی بنا پر صحت کے لیے خراب قرار دے گا۔جبکہ ہمارے مذہب میں آج تک کوئی تبدیلی نہ آئی اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کی گئی۔لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل طرزِ زندگی ہے جو تبدیلی یا بہتری کا شکار نہیں ہے۔کیونکہ یہ نظام اس اللہ کا بنایا ہوا ہے جو تجربے کا نہیں بلکہ غیر محدود سمجھ کا ملک ہے۔ایک اور نقطہ فکر یہ جو اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں یاد رکھنا پڑے گا وہ انسان کی محدود سوچ ہے جیسا کہ ایک شاعر کا کہنا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ محدود لامحدود تک پہنچ سکے۔اللہ تعالیٰ کی صفات تو لامحدود ہیں ہم اگر اپنی ساری سوچ' عقل اور معلومات استعمال میں لے آئیں تو بھی زیادہ دور نہیں جائیں گے۔یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے وہ ہماری سوچ کے مطابق ہے۔قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

> '' کہہ دیجئے کہ اگر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لئے سمندر سیاہی بن جائے تو وہ بھی میرے رب کی باتوں کو ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا گو ہم اس جیسا اور بھی اس کی مدد میں لے آئیں۔ '' (109: 18)

سب سے اہم بات جو ذہن میں رکھنی پڑے گی وہ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو چھپایا نہیں ہے بلکہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے تصور کے بارے میں واضح ہدایات موجود ہیں۔

> '' اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اس کے نور کی مثال ایسے ہے کہ گویا ایک طاق ہے۔جس میں ایک چراغ ہے اور چراغ ایک قندیل ہے اور قندیل (ایسی صاف شفاف ہے کہ) گویا کہ موتی کا چمکتا ہوا تارہ ہے اس میں ایک مبارک درخت کا تیل جلایا جاتا ہے۔یعنی زیتون کہ نہ مشرق کی طرف نہ مغرب کی طرف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تیل خواہ آگ اسے نہ بھی چھوئے جلنے کو تیار ہے (بڑی) روشنی پر روشنی ہو رہی ہے (اللہ اپنے نور سے جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ دکھاتا ہے اور اللہ جو مثالیں بیان فرماتا ہے تو لوگوں کو (سمجھانے کے لیے) اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ ''

(24: 35)

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں اتنی واضح تصویر پیش کی ہے تو ہم یہ کیوں کہتے ہیں کہ اللہ نظر نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگوں کو اسے دیکھنا نہیں آتا۔ جب چھوٹے چھوٹے بچے یہ سوال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہیں وہ کیوں نظر نہیں آتا تو ماں باپ اس طرح کا جواب دیتے ہیں کہ اگر وہ نظر آئے گا تو سب بچے اسے تنگ کریں گے کہ ہمیں کھلونے چاہئیں یا ٹافیاں۔ اس طرح کا جواب سننے کے بعد بچے کے ذہن میں اللہ تعالیٰ کا تصور اس طرح بنے گا کہ جیسے کوئی انسان زیادہ کام سے تنگ آ جاتا ہے' اسی طرح اللہ بھی ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ بچے کو یہ بتانا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نظر آتا ہے اور پھر اسے بتائیں کہ کب اور کیسے نظر آتا ہے۔

آیئے آج یہ سیکھیں کہ اللہ کیسے نظر آتا ہے۔ جب یہ سوال عام لوگوں میں کیا گیا کہ اللہ نظر آتا ہے؟ تو 99% لوگوں نے اقرار کیا کہ نظر آتا ہے۔ جن لوگوں کو واضح اور ٹھوس حقیقت کی طرح نظر آتا ہے ان کی تعداد کچھ کم ہے۔ لیکن زیادہ تر لوگوں نے اقرار کیا ہے کہ کافی محنت کرنی پڑتی ہے پھر نظر آتا ہے اور کچھ کا کہنا ہے کہ نشانیاں بہت سی ہیں بس انہیں میں نظر آتا ہے۔ ایک دلچسپ واقعہ اس صورت حال کو واضح کرتا ہے۔ امامِ غزالیؒ اسلامی علم کے بڑے ماہر مانے جاتے تھے۔ ایک دفعہ امام غزالیؒ ایک جگہ سے گزر رہے تھے تو عقیدت سے لوگ جمع ہو گئے ایک بوڑھی عورت نے (جو صحیح طور پر دیکھ نہیں پا رہی تھی) کسی سے پوچھا کہ یہ ہجوم کیسا ہے؟ کسی نے جواب دیا کیا تم انہیں جانتی ہو! یہ تو وہ بندہ عالم ہے جو اللہ تعالیٰ کے وجود کے ہزار ثبوت دیتا ہے۔ بوڑھی عورت بولی تو پھر کیا ہوا ہزار ثبوت اسی کو چاہئیں جس کے دل میں ہزار وہم ہوں۔ امامِ غزالیؒ بہت متاثر ہوئے اور دعا مانگی کہ اے اللہ مجھے بھی اعتقاد کی وہ طاقت دے جو بزرگوں کے پاس ہوتی ہے۔ یقیناً ان لوگوں کو ثبوت نہیں چاہئیں جو کہ اسے واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں لیکن ان لوگوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے جو اس نعمت سے محروم ہیں۔ اگر ہم اللہ کو تلاش کریں تو اس کی نشانیاں تو ہر ایک چیز میں موجود ہیں۔ ایک پتے کو لے لیں' انڈیا میں ایک سائنس دان 15 سال تک ایک پتے پر ریسرچ کرتا رہا اور پھر بھی اس کا کام شاید مکمل نہیں ہوا۔ ایک پتے کے اندر اتنا زیادہ منظّم نظام موجود ہے کہ جس کو سمجھنے کے لیے اتنا وقت بھی کم ہے۔ ہمارے اردگرد اتنے زیادہ پتے موجود رہتے ہیں کہ ہماری زندگی میں ان کی اہمیت نہیں ہے۔ اس لیے ہم غور نہیں کرتے لیکن اللہ کی کائنات میں ان کا کام بہت اہم ہے۔ ایک بچے کی پیدائش لے لیں' سائنس کی بے پناہ ترقی کے باوجود یہ ایک ایسا قدرتی نظام ہے جو انسان کے کنٹرول سے باہر ہے اس طرح کے اہم کاموں کو کوئی اور طاقت ہی کنٹرول کرتی ہے اور وہ اللہ کے علاوہ کون ہو سکتا ہے۔ انسان کی سوچ صرف یہاں تک ہے کہ طریقے بدل دے لیکن نتائج پھر بھی اللہ کے کنٹرول میں رہتے ہیں۔ یہ دنیا آج وجود میں نہیں آئی بلکہ ہزاروں سال پرانی تاریخ موجود ہے اسلام تو ابھی نیا اور

تازہ مذہب ہے۔صرف 1500 سال تاریخ کے حساب سے کچھ نہیں ہوتے۔ یہ دنیا اس وقت کافی علوم میں ترقی کر چکی تھی یہ اور بات ہے کہ اسلام کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے جس حصے کو پسند فرمایا تھا وہ غیر ترقی یافتہ تھا شاید اس میں مصلحت ہوگی کہ دنیاوی ترقی کے بغیر اس طاقتور مذہب کو دنیا پر حکومت کا شرف حاصل ہونا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب قرآن پاک گارنٹی کے ساتھ بھیجی اور اس کی حفاظت اس نے اپنے ذمے لے لی۔غور کریں اگر ہم ایک پچاس سال پرانی فلم دیکھیں تو انگریزی یا اردو زبان کتنی بدل چکی ہے۔صرف پچاس سال میں زبان بدل جاتی ہے' لفظوں کے مطلب بدل جاتے ہیں' دوسری زبانوں کا اثر آ جاتا ہے تو پھر یہ کیسا معجزہ ہے کہ 1500 سال میں قرآن پاک کی زبان دنیا کے ہر حصے میں وہی رہی ہے' ایک لفظ بھی نہیں بدلا۔جس زمانے میں قرآن پاک نازل ہوا اس دور میں عرب میں شاعری کا دور تھا۔زبان کے معیار کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ جب ہمارے نبی پاک ﷺ نے قرآن کی آیات لوگوں کو سنائیں تو ان کے معیار پر اُترنے والی شاعری پیچھے رہ گئی اور وہ اس حقیقت سے پریشان ہو گئے کہ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود لکھائی کا یہ معیار نبی پاک ﷺ کے پاس کہاں سے آ گیا۔ یہاں تک کہ نبی پاک ﷺ کی احادیث لکھائی اور قرآن پاک کی زبان میں واضح فرق تھا۔اگر کسی انسان کو دو مختلف زبانوں پر عبور بھی ہو تو لمبے عرصے تک دونوں زبانوں کو علیٰحدہ رکھنا کافی مشکل کام ہے جبکہ قرآن نازل ہونے اور احادیث لکھے جانے کا کام ایک لمبے عرصے یعنی تیس سال پر محیط ہے۔اگر ہم دو زبانیں ساتھ ساتھ استعمال کر رہے ہوں تو اتنے عرصے میں تو زبانیں گھل مل جاتی ہیں جیسا کہ آج کل ہمارے معاشرے میں بہت سے لوگ دو زبانیں یعنی انگریزی اور اردو ساتھ ساتھ بولنے لگے ہیں۔جبکہ قرآن پاک اور احادیث کی طرزِ زبان میں واضح فرق آج بھی موجود ہے۔کیونکہ ایک انسانی زبان اور دوسری اللہ کی زبان۔قرآن پاک میں ایسے حقائق بیان کئے گئے ہیں جو اس زمانے کے انسان کے لیے بہت مشکل تھے۔جبکہ اب یہ حقائق واضح ہونے لگے ہیں۔مثلاً بچے کی پیدائش سے پہلے کی منازل جو انسانی آنکھ سے دیکھنا ممکن نہیں تھے قرآن پاک میں ان کی تفصیل موجود ہے اور آج کی سائنس نے انسان کو سب کچھ دیکھنے کے قابل بنا دیا ہے۔ایک اور مثال جو دو دریاؤں کے آپس میں ملنے کی ہے سائنس دانوں کی تحقیق کے مطابق دو سمندر یعنی بحر احمر اور بحر ہند جب ''Bab-ul-Maudah'' کے ذریعے علیحدہ ہوتے ہیں ان کے اندر کی دنیا ہی فرق ہوتی ہے لیکن وہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں یہی ذکر قرآن پاک میں ہے:

'' اور وہی تو ہے جس نے دو دریاؤں کو ملا دیا ایک کا پانی شیریں ہے پیاس بجھانے والا اور دوسرے کا کھاری چھاتی جلانے والا اور دونوں کے درمیان ایک آڑ اور اوٹ بنا دی۔ '' (25: 53)

نبی پاک ﷺ یہ سب کچھ کیسے جان پاتے' انہوں نے اپنی ساری زندگی سمندر دیکھا ہی نہیں تھا اس کے علاوہ جس

طرح عرب میں ایک عام انسان کی زندگی تبدیل ہوئی وہ اللہ کا ہی کام تھا۔غور کریں آپ خود اپنی ایک عادت بدلنا چاہیں تو بعض اوقات کتنے سال گزر جاتے ہیں۔ایک انسان کا دنیا کو 23 سال کے عرصے میں تبدیل کر دینا اور پھر 1500 سال سے لگاتار بدلتے ہی رہنا ایک معجزہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے جو قوانین قرآن پاک میں بتا دیئے وہ آج بھی بہترین ہیں پوری دنیا ان ہی قوانین کو ڈھونڈنے اور رائج کرنے پر لگی ہے انسانیت کی بھلائی صرف اللہ کے بنائے ہوئے نظام میں ہے۔جن لوگوں کو اللہ ٹھوس حقیقت کی طرح نظر آتا ہے اگر ان کی زندگی قریب سے دیکھیں تو ان لوگوں کی زندگی سے قطعاً مختلف ہے جو اللہ کو دیکھ یا سمجھ نہیں پاتے۔خوف نام کی چیز کا اللہ کے بندوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔انہیں ڈر صرف ایک چیز کا ہوتا ہے اور وہ ہے اللہ کی ناراضگی۔ہمارے نبی پاک ﷺ اس کی بہترین مثال ہیں۔اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ذمے ایک کام لگایا اور آپ ﷺ جانتے تھے کہ انہیں یہ کام کرنے کے لیے زندہ رہنا ہے۔جس کا ثبوت یہ ہے کہ دشمنوں کے اتنے قریب چلے جاتے تھے کہ جہاں ایک عام انسان خوف سے نہیں جا سکتا۔انہیں یہ کام پورا کرنے پر مکمل اعتقاد تھا۔

دیکھنے والوں کو تو وہ ہر سانس کا ساتھ نظر آتا ہے جس کے بغیر ہم سانس لینے کے بھی قابل ہی نہیں۔جو لوگ موت کو قریب سے دیکھتے ہیں انہیں اللہ نظر آ جاتا ہے۔جب کسی کے آگے سے موت ایک لمحے میں ٹل جاتی ہے انہیں بھی اللہ نظر آتا ہے۔ ہر وہ انسان جو بے سہارا اور لاچار ہے اللہ اسے ضرور نظر آتا ہے۔وہ لوگ جو بیمار ہیں اور بستر مرگ پر پڑے ہیں انہیں اللہ ضرور نظر آتا ہے۔مارکیٹ میں چھوٹی چھوٹی چیزیں بیچنے والا محنتی اور ایماندار انسان جو واقعتاً اللہ کا بندہ ہے وہ جو رات کے بارہ بجے تک گھر پہنچے تو اس کے چھوٹے چھوٹے بچے دن کا پہلا کھانا کھائیں گے' ان سے پوچھیں کہ کیا حال ہے تو شکر کرتے ہوئے ان کی زبان نہیں تھکتی۔دراصل انہیں اللہ نظر آتا ہے۔اللہ کو دیکھنے کی مثال تو کچھ ایسے ہے کہ جب سارے جنتی جنت کی طرف لے جائے جائیں گے تو اصل انعام تو ابھی باقی ہوگا اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا نظارہ ہوگا اور کہتے ہیں جنتی جنت کو بھول جائیں گے۔اس دنیا میں بھی اگر ہم اسے دیکھ پائیں تو زندگی کیسی ہوگی اس کا اندازہ تو صرف وہ لوگ لگا سکتے ہیں جو اسے دیکھتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ایک ایسا نور اور ایک ایسی روشنی ہے جو ہماری شاہ رگ سے بھی قریب موجود ہے اور دیکھنے والوں کو صاف نظر آتا ہے۔

دنیا کی ترقی ایک طرف اور اللہ کا نظام ایک طرف مقابلہ کیا ہی نہیں جا سکتا ایک چھوٹی سی مثال لے لیں۔یورپ اور امریکہ کے سارے ماہر مل کر آج تک جانور ذبح کرنے کا ایسا طریقہ نہیں نکال سکے جس میں جانور کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نکل جائے اور گوشت بھی تازہ رہے۔جدید طریقہ کار کچھ اس طرح ہے کہ جانور ذبح کر کے اسے سرد خانوں میں الٹا لٹکا دیا جاتا ہے تاکہ سارا خون نکل جائے اس طریقہ کار میں جانور کا خون نکلنے تک لٹکایا جاتا ہے جس میں

کئی دن لگ جاتے ہیں۔اس کے باوجود کچھ نہ کچھ خون رہ ہی جاتا ہے اس کے برعکس جو طریقہ مسلمان اختیار کرتا ہے وہ واضح طور پر بہترین ہے۔اس طریقے میں گوشت تازہ رہتا ہے اس کے باوجود خون پوری طرح نکل جاتا ہے۔یہ سب ہمیں اللہ نے نہیں تو کس نے سکھایا ہے۔دراصل سوال تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ اللہ کہاں نظر نہیں آتا؟ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں اسے دیکھنا نہیں آتا اور اکثر اوقات تو سب کچھ دیکھنے کے باوجود ہم گونگے' بہرے اور اندھے بن جاتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے ایک کبوتر جب یہ دیکھتا ہے کہ بلی سامنے ہے اور اب وہ کچھ نہیں کر سکتا تو وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے اور اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دینے کی کوشش کرتا ہے کہ بلی ہے ہی نہیں۔ جب ایک بچہ اپنے باپ سے ڈرتا ہے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ باپ کے گھر آنے سے پہلے جو کرنا ہے کر لے تا کہ ڈانٹ نہ پڑے۔آج ہم میں سے اکثر گونگے' بہرے اور اندھے بن کر رہنے میں ہی خوش ہیں کیونکہ اگر اللہ نظر آنے لگا تو وہ تو ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے ہم زندگی کا مزہ کیسے اٹھائیں گے؟ ہر گناہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی موجودگی ہمارے لیے مسئلہ بن جائے گی۔ضمیر ہمیں جینے نہیں دے گا' یہ نہ کرو وہ نہ کرو' یہ نہ کھاؤ وہ نہ پیو کیا کسی نے صحیح کہا ہے کہ یہ زندگی ہی نقد ہے آخرت کو چھوڑ دو تو ادھار ہے۔لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تو نظر آتا ہے ہم ہی گونگے' بہرے اور اندھے بنے ہوتے ہیں تا کہ ہماری عیاشیاں ہم سے چھوٹ نہ جائیں۔

اللہ کے تصور سے تو کردار کی تکمیل ہوتی ہے۔جب ایک انسان اللہ کے وجود کو محسوس کرے گا تو برائی کیسے کرے گا اگر بہت ڈھیٹ بھی ہوگا تو بھی احساس جرم کا شکار رہے گا اور یہ احساس جرم ایک ایسی کیفیت ہے جس میں انسان سخت بے چین رہتا ہے اور ہر قیمت پر اس کیفیت سے نکلنا چاہتا ہے اور یہاں سے انسان کے کردار کی تعمیر شروع ہوتی ہے۔اس کے برعکس وہ انسان جو ہر قدم اٹھاتے ہوئے اللہ کے وجود کو محسوس کرتا ہے وہ اسی کوشش میں رہتا ہے کہ اس اللہ کو کبھی ناراض نہ کرے بلکہ اپنے ہر عمل سے اسے خوش کرے اور وہ جب بھی اچھا کام کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ کو بتانے کے لیے انتظار کی کیفیت سے نہیں گزرنا پڑتا لہٰذا ایک کے بعد ایک اور اچھا کام کرنا اس کے کردار اور شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے۔اس طرح کے لوگوں کی مثال اس طرح ہے کہ وہ دنیاوی اتار چڑھاؤ سے بے خبر اپنی باکردار زندگی میں مگن رہتے ہیں۔انہیں سرخ بتی پر رکنے کے لیے سپاہی کی ضرورت نہیں ہوتی۔کردار کے لحاظ سے یہ لوگ اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ دنیا تباہ ہو جائے لیکن کردار پہ آنچ نہ آنے دیں گے۔ان لوگوں کو اللہ نظر آتا ہے۔

☆ _____ ☆

غیر خدائی طاقتیں — جادو ٹونہ

جادو برحق ہے اس کا ثبوت ہمیں قرآن پاک سے ملتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ قرآن پاک میں ہی ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ جادو سے چیزیں صرف محسوس ہوتی ہیں۔ یعنی جادو ایک ایسا عمل ہے جس سے انسانی ذہن پر اثر ہوتا ہے کہ چیزیں حرکت کرتی نظر آتی ہیں۔ جیسا کہ حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے واقعہ میں آتا ہے کہ جب فرعون کے درباری جادوگروں نے چند چیزوں کو زمین پر پھینکا اور وہ سانپ کی طرح نظر آنے لگ گئیں لیکن جب حضرت موسیٰؑ نے اپنی چھڑی پھینکی تو وہ اصلی سانپ بن گئی اور دوسرے سانپوں کو کھا گئی۔ جب جادوگروں نے محسوس کیا کہ حضرت موسیٰؑ کا سانپ اصلی ہے تو ڈر گئے اور اللہ تعالیٰ کی طاقت سے مرغوب ہو گئے۔

یہ تو ہم جانتے ہیں کہ توہمات کا انسانی ذہن پر گہرا اثر ہوتا ہے اور نفسیات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کچھ عرصے تک سوچتا رہے کہ وہ بیمار ہے تو وہ واقعی بیمار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب ہم جادو وغیرہ پر یقین کر لیتے ہیں تو اس کے اثرات قطعاً نظر آنے لگتے ہیں۔ جادو کا ذکر قرآن پاک میں ایک سے زیادہ دفعہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں دو فرشتے اسی کام کے لیے زمین پر بھیجے گئے۔ یہ دو فرشتے لوگوں کو کالا علم سکھاتے جو ان سے سیکھنا چاہتا اور یہ بھی بتاتے کہ یہ سیکھنے سے ایمان جاتا رہے گا۔ لوگوں نے اس علم سے یہ سیکھا کہ میاں بیوی کے درمیان جھگڑا کرا دیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے کہ جادو سے کسی کو نقصان نہیں ہو سکتا جب تک کہ اللہ کی رضا اس میں شامل نہ ہو۔

> ''اور ان کے پیچھے لگ گئے جو سلیمان کے عہد سلطنت میں سلاطین پڑھا کرتے تھے اور سلیمان نے مطلق کفر کی بات نہیں کی بلکہ شیطان ہی کفر کرتے تھے کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور ان باتوں کے بھی (پیچھے لگ گئے) جو شہر بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر اتری تھیں اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو آزمائش ہیں تم کفر میں نہ پڑو۔ غرض لوگ ان سے ایسا (جادو) سیکھتے جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں اور اللہ کے حکم کے سوا اس سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔'' (2: 101)

غور کریں تو یہ معاملہ بھی دماغی اثر رکھتا ہے۔ یعنی میاں بیوی میں جھگڑا بھی ذہنی طور پر اثر کر کے کروایا جا سکتا ہے۔ اسلام کے ایک عالم سید قطب مرحوم اپنی کتاب (In The Shade of Quran) میں لکھتے ہیں

کہ جادو توہمات کا نتیجہ ہوتے ہیں اور جادو کرنے والے کی خواہشات کے زیر اثر بھی۔اس کے ذریعے سے نہ تو کوئی نئی چیز سامنے آ سکتی ہے اور نہ ہی چیزیں بدلی جا سکتی ہے۔اس کے اثر سے کسی انسان کے ذہن پر اثر ضرور کیا جا سکتا ہے۔جس کی وجہ سے وہ انسان جادو کرنے والے کی خواہش پوری کر سکے۔اس سے آگے سید قطب مرحوم بڑے صاف الفاظ میں لکھتے ہیں کہ اس سے زیادہ کالے جادو کی وضاحت کرنے کو بالکل ضروری نہیں سمجھتے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو شعور دیا اور پھر بہت سی چیزیں اس کی عقل پر چھوڑ دیں تا کہ خود اچھے برے کا تعین کر سکے۔کالا علم، جادو اور تعویز وغیرہ انسان کی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اس کی مثال اس واقعہ سے ملتی ہے کہ ایک خاندان میں جھگڑا ہو گیا کافی گرما گرمی کے بعد ایک فریق نے دوسرے کو دھمکی دی اب دیکھنا کہ میں بدلہ کس طرح لوں گا تم یاد کرو گے اور تمہاری چھوٹی بیٹی کی شادی نہیں ہو سکے گی۔(غالباً اسی لڑکی کے رشتے کے سلسلے میں جھگڑا کھڑا ہوا تھا (اور اب کئی سال گزرنے کے بعد بھی اس لڑکی کی شادی ابھی تک نہیں ہو سکی۔ماں تعویز گنڈوں کے چکر میں پڑی ہے کہ کسی طرح جادو کا اثر ختم کیا جائے۔بہت سے پیروں فقیروں کی روزی ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں لگی ہوتی ہے۔خاتون کے دو بڑے بیٹے ہیں جن کی شادیاں بھی اسی وجہ سے رکی ہوئی ہیں کہ جب تک چھوٹی بہن کی شادی نہیں ہو گی بھائیوں کی شادیاں نہیں ہو سکیں۔غور کریں اگر کسی لڑکی کے بارے میں یہ مشہور ہو کہ اس پر جادو ہے تو اس سے شادی کون کرے گا۔جو کوئی رشتہ آئے گا وہ جب لڑکی کے بارے میں ادھر ادھر سے پتہ لگائیں گے تو یہی حقیقت سامنے آئے گی۔حالانکہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر کسی نے جادو کیا بھی ہے تو لڑکی پر تو شاید کیا جا سکتا ہے لیکن وہ سارے لوگ جو کہیں نہ کہیں سے رشتے کے لیے آتے ہیں ان سب پر جادو کیسے کیا جا سکتا ہے۔لوگ اپنی ہی غلطیوں کا خمیازہ اس طرح بھگتتے رہتے ہیں اور قصوروار دوسروں کو ٹھہراتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہی میں انسان کا سب سے بڑا نقصان ہے۔اس طرح کی توہمات پر یقین کرنا اللہ تعالیٰ سے ناراضگی مول لینے کے برابر ہے۔اس پر مزید یہ کہ دو جوان بیـــــٹـــــوں کی شادی اس لیے روکی گئی ہے کہ بہن کی شادی پہلے ہو جو کہ بذاتِ خود ایک ناپسندیدہ عمل ہے۔ہمارا مذہب شادیوں میں دیر کرنے کو سخت نامناسب قرار دیتا ہے۔

ایک اور دلچسپ واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ اندرون شہر میں ایک حویلی تھی یہ ایک خاندان کی مشترکہ جائیداد تھی۔بہن بھائیوں میں سے جو ضرورت مند ہوتا وہاں رہتا۔ان میں سے ایک خاندان کو ہم جانتے ہیں ان کی عادتیں عجیب و غریب تھیں۔درباروں پر دعائیں مانگنا اور تعویز وغیرہ پر یقین کرنا تو معمول تھا اس کے علاوہ بہت سی بنیادی خرابیاں اس خاندان میں موجود تھیں اور نتیجتاً حالات خراب رہتے تھے۔کسی نے انہیں مشورہ دیا کہ ایک بزرگ جو کہ دعائیں کرنے میں بڑا نام رکھتے تھے۔ان سے جا کر پوچھیں کہ کیا کرنا چاہیئے۔اب بجائے اس کے کہ وہ بزرگ عقل و

دانش سے کام لیتے اور انہیں مشورہ دیتے کہ اگر آپ لوگ کچھ ایسے کام کر بیٹھے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہیں تو معافی مانگیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اس حویلی میں رہنے سے سب خرابیاں ہیں اس پر سایہ ہے۔ انہوں نے حویلی گرادی اور آج تک کرائے کے گھروں میں مارے مارے پھر رہے ہیں اور ابھی بھی یہی کہتے ہیں کہ اس جگہ پر سایہ ہے۔ جس وجہ سے یہ بک نہیں رہی۔ پورا خاندان تباہی کا شکار ہے لیکن اپنے آپ کو ٹھیک کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔

جادو وغیرہ کے ڈر سے بچنے کے لیے نبی پاک ﷺ کی سنت، قرآن پاک کی دو صورتوں کی تلاوت باکثرت سے کرنی چاہیئے۔ جس طرح جسمانی بیماری کسی کمزوری سے لگتی ہے۔ اس طرح ذہنی بیماریاں جیسے غم و فکر، مایوسی، ڈر، توہمات پرستی اور وہم روحانی کمزوری کی وجہ سے لگتی ہیں۔ ان سے بچنے کے لیے قرآن پاک کی تلاوت، نماز کی پابندی اور ہر گناہ سے بچنے کے لیے کوشش ہی ان بیماریوں کا علاج ہے۔ یہ جان لینے کے بعد کہ جادو برحق ہے یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ نبی پاک ﷺ کی روحانی حالت تو کائنات میں ہر شے سے بڑھ کر تھی تو پھر ان پر جادو کا اثر کیسے ہو گیا۔ معاملہ کچھ ایسے ہے کہ دورِ جہالت میں جادو ٹونہ بہت عام تھا جہاں کافروں نے آپ ﷺ سے دشمنی میں کوئی کسر نہ چھوڑی وہ اس ہتھیار کو کیسے استعمال نہ کرتے۔ جب اسلام کی دعوت چاروں طرف پھیلنے لگی تو کفار کی مخالفت بھی شدت اختیار کر گئی۔

شیاطین، جن و اِنس ہر طرف پھیل گئے تا کہ لوگوں کے دلوں میں آنحضرت ﷺ کے خلاف، آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کے خلاف لوگوں کے دلوں میں کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈالا جائے۔ جس سے لوگ بدگمان ہو جائیں۔ روایات کے مطابق اسی دشمنی کی انتہا یہ تھی کہ آپ ﷺ پر جادو کئے گئے۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب نبی پاک ﷺ مدینہ واپس تشریف لائے تو خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ آیا تو ایک مشہور جادوگر لبید بن اعصم نے نبی پاک ﷺ پر زور کا جادو کر دیا۔ اس زمانے میں رسول اللہ ﷺ کے ہاں ایک یہودی لڑکا خدمت گار تھا۔ اس سے ساز باز کر کے ان لوگوں نے جادو کیا۔ بعض روایات کے مطابق لبید بن اعصم نے خود جادو کیا اور بعض روایات کے مطابق اس کی بہنیں جو اس سے بھی بڑھ کر جادوگرنیاں تھیں انہوں نے یہ جادو کیا۔ اس جادو کا اثر ہوتے ہوتے نبی پاک ﷺ پر پورا ایک سال لگا۔ اس کا اثر آپ ﷺ پر یہ ہوا کہ آپ ﷺ گھلتے جا رہے تھے۔ کسی کام کے سلسلے میں خیال فرماتے تھے کہ کر لیا ہے لیکن کیا نہیں ہوتا تھا۔ بعض اوقات آپ ﷺ کو اپنی نظر پر شبہ ہوتا تھا یہ اثرات آپ ﷺ کی ذات تک محدود رہے۔ حتیٰ کہ دوسروں کو معلوم تک نہ ہو سکتا کہ آپ ﷺ کی ذات پر کیا گزر رہی ہے۔ رہی آپ ﷺ کے نبی ہونے کی بات تو آپ ﷺ کے فرائض کے اندر کوئی خلل واقع نہ ہونے پایا۔ روایت میں یہ نہیں آیا کہ آپ ﷺ قرآن پاک کی کوئی آیت بھولے ہوں یا آپ ﷺ نے کوئی آیت غلط پڑھی ہو یا اس طرح کوئی چیز بھی آپ ﷺ کے سلسلہ

نبوت میں دخل انداز ہوئی ہو۔ ذاتی حیثیت میں اگر آپ ﷺ کو زخمی کیا جا سکتا ہے جو کہ جنگ احد میں ہوا' آپ ﷺ گھوڑے سے گر کر چوٹ کھا سکتے ہیں۔ جیسا کہ احادیث سے ثابت ہوا ہے کہ اسی طرح آپ ﷺ کو نماز میں بچھو کاٹ سکتا ہے۔ تو ان میں سے کوئی بھی چیز اس تحفظ کے منافی نہیں ہے جس کا نبی ہونے کے ناطے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے وعدہ کیا تھا۔ لہٰذا جادو کے اثرات سے بیمار ہونا بھی نا قابل یقین نہیں ہونا چاہیئے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاں اس دنیا میں کئی طرح کے امتحانات اور آزمائشیں ہیں۔ کالا جادو بھی اسی طرح ہے۔ جس طرح ہر بیماری کا علاج اور شفاء قرآن پاک میں موجود ہے اسی طرح کالے جادو سے بچنے کے لیے بھی قرآنی آیات کا سہارا لینا چاہیئے۔ یعنی روحانی صحت برقرار رہے اور انسان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دے دے۔ تو یقیناً اللہ بڑا مہربان ہے اور اپنی مخلوق سے بے پناہ محبت کرنے والا بھی ہے۔ ہمارا معاشرہ عجیب سی صورت حال سے دوچار ہے چاروں طرف مایوسی اور بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ بے چینی نہ صرف مجموعی طور پر بلکہ انفرادی طور پر بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ ایک طرف مہنگائی اور بے روزگاری نے لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے تو دوسری طرف گھر گھر لڑائی جھگڑے' حسد' جلن' غصہ اور نفرت جیسی عادتوں نے لوگوں کی جسمانی' جذباتی' دماغی اور روحانی حالت تباہ کر کے رکھ دی ہے۔ ایسے معاشرے میں جادو ٹونہ جیسے گناہ کا عام ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ ایک معاشرہ جس کا ''Faith'' تباہ ہو چکا ہو ایسے جھوٹے اور شیطانی ہتھکنڈوں کا سہارا لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہر دوسرا گھر جادو ٹونہ اور تعویز طریقے کا شکار ہے۔ کم علمی کا یہ عالم ہے کہ لوگ اس مشکل سے بچنے کے لیے جس طریقے کو اپنا رہے ہیں وہ ایک ایسا طریقہ ہے جو بذات خود اللہ کی نافرمانی اور غضب کا باعث بنتا ہے۔ اول تو لوگوں نے جادو ٹونے اور تعویز کنڈوں کو کھیل تماشہ سمجھ لیا ہے۔ ہر ماں یہ سمجھتی ہے کہ اس کا بیٹا تو بہت قابل ہے بس فلاں فلاں سے دیکھا نہیں جاتا اس لیے اس پر کچھ کرا دیا ہے کہ نوکری نہ ملے' نہ بزنس چلے اور جب بھی بیٹی کا سسرال میں جھگڑا ہوتا ہے تو بجائے اس کے کہ عقلمندی کا مظاہرہ کیا جائے اور سمجھ بوجھ سے معاملے کو سلجھانے کی کوشش کی جائے دونوں خاندانوں میں مقابلہ بازی شروع ہو جاتی ہے۔ کون زیادہ بہتر پیر فقیر ڈھونڈ کر دوسری پارٹی کو نیچا دکھاتا ہے۔ جادو ٹونہ کوئی ایسا عمل نہیں ہے جو راتوں رات اثر کر دے یا پھر کوئی بیٹھے بٹھائے دوسرے پر کر دے۔ اس لیے عام زندگی میں اس کے اثرات ایسے نہیں ہو سکتے کہ ہر ایک پر کچھ نہ کچھ کیا جائے۔ ہمارے معاشرے میں پچاس فیصد لوگ تو واقعی ہی اس برائی میں مبتلا ہیں اور باقی پچاس فیصد اس صورت حال میں صرف غلط فہمی کا شکار ہیں۔ اس طرح یہ مسئلہ سو فیصد ہمارے ذہنوں پر حاوی ہے۔ جیسے ہی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے' چاہے وہ اپنی غلطی کی وجہ سے ہی ہو سب سے پہلے دھیان اسی طرف ہی جاتا ہے کہ کسی نے جادو ٹونہ یا تعویز کر دیا ہے۔ اس پر یہ کہ تعویز اور دوسرے عمل اس طریقے سے کئے جاتے ہیں جو مزید گناہ کا باعث بنتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن پاک کا ہر لفظ بے انتہا طاقت اور اثر رکھتا ہے۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم بہر حال اس سے اوپر ہے۔ نبی پاک ﷺ نے جو تعویز لکھ لکھ کر گلے میں پہنے یا تکیہ کے

نیچے رکھے دعا فرمائی ہے کہ ان کا مسئلہ کبھی حل نہ ہو اور ہم جانتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ کی کوئی دعا کبھی اللہ تعالیٰ نے رد نہیں کی (یہاں تعویز سے مراد دم درود نہیں بلکہ دم درود اور جھاڑ جو کہ قرآنی آیات سے کیا جائے بہت سی تکالیف دور کرتا ہے) کچھ لوگ طرح طرح کے وظیفے کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ قرآن پاک کا اس طرح سے استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ خوش ہو جائے گا اور انکا مسئلہ حل ہو جائے گا حالانکہ اس کو خوش کرنے کا طریقہ تو قرآن پاک پر عمل کرنے پر ہے نہ کہ رٹو طوطوں کی طرح اس کا پڑھنا ہے۔ کچھ لوگ اس طرح کے وظیفوں کو زیادہ موثر بنانے کے لیے کھانے پینے کی حلال چیزوں سے بھی پرہیز کرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس عمل کو منع فرمایا ہے۔

" مومنو! جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں ان کو حرام نہ کرو اور حد سے نہ بڑھو کہ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ " (5: 86)

کسی پیر فقیر کی بات مان کر اپنے اوپر اس چیز کو حرام کر لینا جو اللہ نے حلال قرار دی ہے اللہ کی ناراضگی کے علاوہ ہمیں کچھ نہیں دے سکے گی۔ اسی طرح بعض لوگ وظیفوں کے دوران لوگوں کے فوت ہونے پر تعزیت کے لیے نہیں جا سکتے۔ یہ بھی غلط ہے کیونکہ ہمارے مذہب میں حقوق العباد بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ بیماریوں کے علاج کے لیے لوگ قرآنی آیات لکھ کر پھر جلا کر وہ راکھ پانی میں ڈال کر پیتے ہیں اس طرح کا پانی صرف پیٹ درد کا باعث بن سکتا ہے نہ کہ شفا کا۔ اللہ تعالیٰ کا کلام اس بات کا محتاج نہیں ہے کہ اسے لکھ کر اللہ کو یاددہانی کرائی جائے بلکہ یہ سب کچھ کرنا اس کی ناراضگی مول لینا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے مسئلے حل ہو جائیں تو ہمیں وہی کرنا پڑے گا جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اور وہ ہے قرآن پاک کو پڑھنا، سمجھنا اور اس پر عمل کرنا۔ اسکے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق زندگی گزارنے میں ہی ہماری نجات ہے۔

☆ _____ ☆

مقامِ مسجد

اصلاح شریعت میں اللہ کے سامنے عاجزی اور اس طرح کی عبادت کو سجود کہتے ہیں۔ یہ لفظ انسان، حیوان اور جمادات کے حق میں عام ہے اس لحاظ سے لفظ مسجد اسلامی عبادت گاہ کا نام ہے۔ چونکہ عبادت میں سجدہ ایک اہم رکن ہے اس لیے اس کی اہمیت اور نماز کی غرض وغایت کو اجاگر کرنے کے لیے شریعت اسلامیہ میں عبادت گاہ کو مسجد کہا جاتا ہے۔ ہر جگہ جہاں عبادت کی جائے وہ مسجد ہے۔ دنیا بھر کی مساجد میں بیت اللہ شریف کو خصوصی مقام کی بنا پر مسجد الحرام یعنی حرمت وعزت والی مسجد کہا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں مسجد الحرام کو فروغ ہے۔ لہٰذا قرآن کریم میں اس کے حقوق وفرائض کی طرف بھی واضح ارشادات کئے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ " انہیں قبلہ رخ پر تعمیر کیا جائے۔"

" انہیں منافقت و ریاکاری کی بجائے جذبہ خلوص سے تعمیر کیا جائے۔ " (9: 17)

نیز نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ دنیا کے تمام خطوں سے مسجدیں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ اس بات پر آپ ﷺ نے مساجد کی تعمیر کو جنت میں اپنا گھر بسانے سے تعبیر فرمایا اور مسجد میں صبح وشام کے کچھ لمحے گزرنے کو جنت میں خدا کی مہمانی قرار دیا۔ الغرض مساجد تعمیر کرنے، انہیں آباد رکھنے، ان کی خبر گیری اور سب سے بڑھ کر ان میں فریضۂ صلوۃ وعبادت بجالانے کی بے حد فضیلت بیان کی گئی ہے۔

مساجد کا آغاز ہجرت سے پہلے مکہ میں ہی ہو چکا تھا لیکن اسلام کی پہلی مسجد "مسجد نبوی ﷺ" ہے جس کی تعمیر کے لئے زیر تجویز جگہ صاف کی گئی، کھجور کے درخت کاٹ دیئے گئے اور دیوار چنی گئی۔ عمارت کے کچھ حصے میں صحن چھوڑ دیا گیا تھا۔ احاطہ کی دیوار اینٹ کی اور اس کی بنیاد پتھروں کی تھی اور اس میں تین دروازے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ جن کے ستون پتھر کے تھے۔ قبلے کی جانب کی دیوار کھلی رکھی گئی تھی۔ کھجور کے درختوں کے تنے جنہیں کاٹا گیا تھا بہت جلد ستونوں کی شکل میں کھڑے کر دیئے گئے اور ان پر کھجور کی شاخوں اور چکنی مٹی کی چھت ڈال دی گئی۔ دو جھونپڑیاں رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ کے لیے بنا دی گئیں۔ ان کے دروازے صحن کی جانب کھلتے تھے۔ بعد ازاں ان کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا۔ جب قبلہ کا رخ بجانب جنوب ہو گیا تو شمالی دروازے کا سائبان برقرار رہا۔ اس سائبان میں جسے صفہ یا طالہ کہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب آتے رہتے تھے یہ نہایت ہی سادہ سی مسجد تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی مسجد میں بنو ثقیف کے نمائندوں سے گفت وشنید کی اور ان کے قیام کے لیے آپ ﷺ نے اس میں تین خیمے بھی لگوا دیئے تھے۔

بنو یتیم کے نمائندے بھی آزادی کے ساتھ مسجد میں چلتے پھرتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کو بلا بھیجتے تھے۔ جو نماز کے بعد آپ ﷺ سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ احد کی جنگ کے بعد مدینہ منورہ کے سرداروں نے رات اسی مسجد میں بسر کی۔ بنی اویس کے لوگوں نے اپنے زخموں کی مرہم پٹی یہاں کی۔ ایک جنگی قیدی کو مسجد کے ستون سے باندھا بھی گیا۔ کئی حاجت منداور غریب لوگ صفہ میں رہا کرتے تھے۔ لوگ جس طرح چاہتے مسجد میں آ کر بیٹھ جاتے تھے مسجد میں محمد ﷺ تحائف وصول کرتے اور اپنے اصحاب میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ کاروبار کے متعلق بات چیت بھی ہوا کرتی تھی۔ یہ مسجد ایک کثیر المقاصد مرکز کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ مسجد عام معاشرتی ضرورتوں میں کام آنے کے علاوہ اس نئی قوم کے لیے سیاسی اور مذہبی مرکز تھی۔

نمازیوں کے علاوہ یہ وہ مقام تھا جہاں مسلمان رسول اللہ ﷺ کے گرد جمع ہو کر معاملات عامہ پر گفتگو کرتے تھے وہیں پر آپ ﷺ خطبے بھی سناتے جن میں نہ صرف اطاعت خداوندی کی تلقین کی جاتی تھی بلکہ قوم کی مجاسی زندگی کے متعلق بھی قوائد بتائے جاتے تھے۔ اس مسجد پر کچھ کچھ ان خصوصیات کا بھی اثر پڑا جو کعبۃ اللہ سے کسی حد تک متعلق تھیں۔ تاہم ہجرت کے بعد باقاعدہ مسجد کا درجہ مسجدِ نبوی ﷺ کو حاصل ہوا۔

اسلامی مسجد کا موجود نمونہ بتدریج مرتب ہوا ہر دور میں ہر علاقے کی ثقافت کے مطابق مسجدوں میں خوبصورتی پیدا کی گئی۔ بادشاہی مسجد ہو یا فیصل مسجد ہر مسجد اپنی اپنی جگہ بے حد خوبصورت اور تعمیری ترقی کا شاہکار ہے۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ مسجد نبوی ﷺ ایک سادہ سی مسجد تھی لیکن اس کے مقاصد بہت وسیع اور واضح تھے۔ آج ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مسجدوں کی خوبصورتی کے علاوہ کون سی چیزیں مسجدوں میں شامل ہو گئی ہیں' یا نکال دی گئی ہیں اور ہم کس طرح مسجد کا تقدس واپس لا سکتے ہیں۔ اب تک تمہید میں جو حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مسجد اسلام میں ایک ادارہ تھی جسے ہم آج کی زبان میں (Islamic Community Centre) کہہ سکتے ہیں۔ جبکہ آج بڑی بڑی مسجدیں یا تو سیاحوں کی تفریح گاہ کے طور پر زیادہ استعمال ہو رہی ہیں یا پھر کسی نہ کسی فرقے کے ہتھے چڑھ چکی ہیں۔ ایک سروے کے مطابق 99% فیصد لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ مسجد کے مقاصد کیا ہیں۔ ان میں 99% فیصد وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ان مسجدوں کو چلا رہے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ہمیں اپنے سروے کے دوران ایک آدھ ہی ایسی مسجد ملی جو صحیح معنوں میں مسجد کہلانے کی حق دار تھی۔

ایک مولوی صاحب ہی ہیں جسے مسجد کا ہیڈ کہا جا سکتا ہے۔ وہ جو چاہے سکھا دے' جو چاہے پڑھا دے۔ جبکہ ہمارا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مسجدوں کو چلانے والے لوگوں میں خواندگی کی شرح بہت کم ہے وہ بچے جو کسی وجہ سے سکول نہیں جا سکتے حافظ قرآن یا قاری بنا دیئے جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں تو ایک تکلیف دہ حقیقت یہ بھی سامنے آئی کہ کئی حافظ اور

قاری قرآن پاک کے ترجمے سے ناواقف ہیں۔ اکثر لوگوں نے زندگی گزارنے کا یہ آسان طریقہ اس لیے بھی اختیار کیا ہے کہ کوئی اور کام نہ کرنا پڑے۔ کھانے کا بھی مسئلہ نہ رہے جگہ اور عزت کا بھی۔ عزت واحترام کا لبادہ اوڑھے یہ لوگ بعض اوقات ایسے گھناؤنے افعال کا ارتکاب کرتے ہیں جو کہ بیان سے باہر ہے۔ لوگ ان حضرات کی ظاہری شکل وصورت اور حلیے سے دھوکہ کھا کر اپنے معصوم بچے ان کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ جو ان کے ظلم کا شکار بنتے ہیں ان بچوں سے چھوٹے بڑے ہر طرح کے کام کروائے جاتے ہیں۔ مار پیٹ الگ برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اگر بچہ شکایات کرے تو گھر سے الگ مار پڑتی ہے کیونکہ مولوی صاحب کے خلاف کوئی سننے کو تیار نہیں ہوتا بلکہ گھر والے یہ سمجھتے ہیں کہ بچہ پڑھنا نہیں چاہتا اس لیے یہ بہانہ گھڑ رہا ہے۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں آ سکتا کہ ان کا بچہ کس کرب سے گزر رہا ہے۔

اکثر مسجدوں کے کرتا دھرتا مولوی صاحبان کی عادات اور ذہنی پستی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک قاری صاحب قرآن پاک کی تعلیم دینے کے لیے ایک گھر جاتے تھے چونکہ مولوی صاحب کی عادت تھی کہ جیسے ہی موقع ملتا بچوں کو سر پر زور سے تھپڑ مارتے یا کان بری طرح کھینچتے۔ یہ صورت حال دیکھ کر خاتون خانہ کی کوشش ہوتی کہ آس پاس ہی رہیں تا کہ بچے جو کہ قاری صاحب سے بہت ڈرتے تھے کسی طرح بیٹھے رہیں اور قاری صاحب بھی ہاتھ روک کر رکھیں۔ اب چونکہ قاری صاحب حافظ قرآن بھی تھے وہ سپارے کی طرف تو دیکھتے ہی نہیں تھے ان کی نظریں گھر میں چاروں طرف گھومتی تھیں۔ خاتون نے پریشان ہو کر اپنی ملازمہ سے کہا کہ تم بچوں کے پاس بیٹھ جایا کرو تو ملازمہ نے یہ کہہ کر بیٹھنے سے انکار کر دیا کہ آپ مجھ سے جتنا چاہیں اور کام کرا لیں یہ نہ کروائیں' یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ آپ خود اندازہ لگائیں کہ جو کسی کے گھر میں یہ رویہ اختیار کرے وہ مسجد میں جہاں پر اس کو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں کیا کرتا ہوگا۔ دراصل یہ وہی لوگ ہیں جو بچپن میں زبردستی درسگاہ میں بھیج دیئے جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جس طرح کی پرورش ان کی ہوتی ہے اس کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں یہ بچے بڑے ہو کر ذہنی طور پر بیمار اور شکست خوردہ شخصیت کے مالک ہوتے ہیں ان لوگوں پر قرآن پڑھانے کی ذمہ داری ڈالنا ہی سب سے بڑی کوتاہی ہے۔

انسانی نفسیات کے مطابق وہ سب بچے جو تکلیف دہ صورت حال میں قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ قرآن پاک کے ساتھ دکھ درد کا عنصر چسپاں کر لیتے ہیں اور لفظ قرآن پاک 'مسجد' مولوی صاحب یا پھر مذہب کے متعلق کوئی بھی بات ان کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔ ہماری نوجوان نسل میں جو بے زاری مذہب سے پائی جاتی ہے اس کی وجہ بھی یہ مولوی صاحبان ہی ہیں۔ ذرا اندازہ لگائیں وہ مقام جو اللہ کا گھر ہونے کی حیثیت سے دنیا میں سب سے زیادہ محفوظ اور ہر ضرورت مند انسان کے لیے پناہ گاہ ہونی چاہیئے تھی جہالت کی نظر ہونے کی وجہ سے اپنا

مقصداور مقام ہی کھو بیٹھی۔ مسجد کے تقدس کو بحال کرنے کے لیے صحیح علم رکھنے والے مسلمانوں کو آگے آنا چاہیئے تا کہ آہستہ آہستہ تبدیلی لا کر مسجدوں کی وہی حیثیت بحال کی جائے جو اسلام کی روح سے بالکل ٹھیک اقدار کی حامل ہو۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا پڑے گا کہ مسجد چونکہ عبادت گاہ ہے تو عبادت میں کون کونسی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ بنیادی عقائد تو ہیں لیکن عبادت کے زمرے میں تو اور بھی بہت کچھ آتا ہے۔ مثلاً اخلاق، حقوق العباد، انسانیت میل ملاپ وغیرہ۔ وہ ہر عمل جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کیا جائے عبادت ہے۔ مسجد کو صرف نماز، روزے کے لیے مخصوص کر دینا نہایت غلط بات ہے۔

حال ہی میں ہماری ملاقات ایک خاتون سے ہوئی۔ چند ماہ قبل اس خاتون کے شوہر کا اچانک انتقال ہو گیا جس سے ان کی زندگی میں خلا سا آ گیا۔ کسی کی دعوت پر انہوں نے ایک مسجد جانا شروع کر دیا جہاں عورتوں کے لیے بڑا اچھا انتظام تھا۔ خواتین مہینے کا ایک دن مقرر کر لیتیں اور پھر کھانے پینے کی ایک ایک چیز بنا لیتیں اور اس بہانے بچے او رخواتین اکٹھے ہوتے، بیٹھ کر اچھی باتیں کرتے اور خیالات کا تبادلہ ہوتا۔ اس چیز کا ان کی زندگی پر گہرا اثر ہوا کہ اب وہ خاتون مکمل طور پر پُرسکون ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ زندگی کسی اچھے مقصد کے لیے گزاریں۔ اس مسجد میں مختلف موضوعات پر لیکچر بھی ہوتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کے علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اندازہ لگایئے کہ ایک عورت کی زندگی نہ صرف تباہ ہونے سے بچ گئی بلکہ اس میں مثبت تبدیلی بھی آئی۔ عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اس طرح کے لوگ ڈپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں اور باقی زندگی خود بھی تنگ رہتے ہیں اور اپنے اردگرد کے لوگوں کے لیے بھی تکلیف اور دکھ کا باعث بنتے ہیں اور یہ مسئلہ عام طور پر ان سب عورتوں میں پایا جاتا ہے جو گھروں میں فارغ رہتی ہیں۔ زندگی میں اگر کوئی انہونی مصیبت آ جائے یا بچوں کی شادیاں ہو گئیں ہوں یا کرنے کو کچھ نہ ہو تو وہ ہر چھوٹی بڑی مشکل کو سر پر سوار کر لیتی ہیں اور ''Self-peity'' جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ نتیجتاً فضول خرچی، چغلی، لڑائی جھگڑے یا پھر کسی نہ کسی بیماری کا شکار ہو کر زندگی گزارتی ہیں۔ اچھی خاصی پڑھی لکھی خواتین بھی اس مشکل سے دوچار ہیں کہ زندگی کو بہتر طریقے سے کیسے گزارا جائے۔ اس مشکل کا اندازہ لگایئے کہ ایک خاتون کے گھر ان کے نواسے، نواسیاں اور پوتے پوتیاں کچھ وقت گزار کر گئے تو گھر کی ہر چیز الٹ تھی۔ ہم نے ان سے کہا کہ آپ اتنی پریشان ہیں تو انہیں منع کیوں نہیں کرتیں تو کہنے لگیں میرا خیال ہے یہ اللہ تعالیٰ نے میرا وقت گزارنے کا ایک بہانہ بنایا ہے چلو اور کچھ نہیں تو چیزیں ڈھونڈنے اور پھر انہیں جگہ پر رکھنے میں چند گھنٹے ہی گزر جاتے ہیں۔ یہ نہایت تباہ کن رویئے کی مثال ہے۔ صرف وہ انسان جسے واقعی زندگی میں کچھ نظر نہ آ رہا ہو اپنا وقت اس طرح برباد کرے گا۔ مسجدیں تو ان لوگوں کے لیے ہونی چاہیئے تھیں جبکہ ہمارے مولوی صاحبان نے تو عورتوں کے مسجد جانے پر ہی پابندی لگا دی

ہے۔ہمارے معاشرے میں مثبت رویہ اپنانے کے لیے Islamic Community Centre بنانے کی اشد ضرورت ہے۔

فرقہ واردیت نے مسجدوں کے تقدس کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔مسجدیں مختلف فرقوں میں بٹ گئیں ہیں اور ایک فرقے کے لوگ دوسرے فرقے کی مسجد میں قدم نہیں رکھتے۔غلطی سے کوئی بھولا بھٹکا نمازی دوسرے فرقے کی مسجد میں چلا جائے تو سب نمازی اسے گھورنے لگ جاتے ہیں یا پھر نماز مختلف طریقے سے پڑھنے پر لڑائی ہو جاتی ہے۔جب ایک شخص اللہ کے گھر میں آ ہی گیا ہے تو وہ اللہ کی پناہ میں ہے اس طرح چھوٹے چھوٹے اختلاف کو بڑھا کر مسجد کے اصل مقصد سے منحرف ہونے میں بہت نقصان ہے۔جیسا کہ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ مسجد کا مقصد بھلائی پھیلانا ہے اور خاص طور پر آج کے دور میں جب لوگ اسلام سے بہت دور ہوتے جا رہے ہیں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ مسجدوں کو از سر نو مرتب اور منظّم کیا جائے۔

☆ مسجدوں میں تعلیم یافتہ لوگوں کو آگے لایا جائے۔مسجدیں چونکہ ہر محلے میں ہوتی ہیں اسی محلے کے بااثر لوگ مل کر یہ کام کر سکتے ہیں کہ بہترین انسان چن کر مسجد اُن کے حوالے کی جائے جن کے ذریعے ایک طرف تو محلے کے لوگوں کو ایک جگہ مل بیٹھنے کا موقع ملے گا اور ساتھ ہی Community کو Develop کرنے کے لئے ان کی involvement بھی بڑھے گی۔اس طرح لوگوں میں مساجد کے لئے اپنائیت کا احساس بھی پیدا ہوگا۔

☆ مسجدوں میں عورتوں اور بچوں کے لیے انتظام کیا جائے اور اگر مسجد میں جگہ کم ہو تو باپردہ عورتوں کے آنے پر پابندی نہ لگائی جائے۔ کیونکہ اگر ہم اپنے بچوں کو مسجد میں آنے اور مذہب سے لگاؤ بڑھانے میں مدد نہیں کریں گے تو وہ مذہب سے اور دور ہوتے چلے جائیں گے۔آج کے اس تیز رفتار دور میں یہ ذمہ داری صرف آدمیوں پر نہیں ڈالی جا سکتی کہ وہ پانچ وقت کی نماز مسجد میں پڑھیں یا روز مسجد جائیں اور بچوں کو بھی لے کر جائیں۔وقت تبدیل ہونے کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے طور طریقے بھی بدلنے پڑیں گے۔نہیں تو ہماری نسلیں تباہی و بربادی کا شکار ہو جائیں گی۔

☆ مسجدوں میں لائبریریاں ہونی چاہییں جن میں نا صرف مذہبی کتابیں بلکہ دنیاوی علم کی بھی کتابیں شامل ہوں اور لائبریری مسجد کے ساتھ منسلک ہو۔لیکن مسجد میں نماز کی جگہ سے الگ ہو کیونکہ مسجد میں نماز کی جگہ پر جوتے لے کر نہیں جاسکتے اور وضو بھی کرنا ہوتا ہے۔جبکہ لائبریری کے لیے یہ پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔لائبریری میں میز' کرسیاں ہونی چاہیئے تا کہ لوگ آرام سے بیٹھ کر پڑھ سکیں۔یہ ٹھیک ہے کہ زمین پر بیٹھنا ہماری روایات میں شامل ہے لیکن وقت کی ضرورت بہر حال روایات سے زیادہ اہم ہے۔اس افراتفری کے دور میں ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگوں کے لیے اور خاص طور پر نوجوانوں کے لیے آسانی پیدا کیا جائے۔

☆ مساجد کو کسی ایک شخص' مخصوص طبقہ یا گروپ کی اجارہ داری سے پاک کیا جائے۔اور وقتاً فوقتاً مساجد میں علماء' تعلیم یافتہ لوگوں اور اپنے اپنے شعبے میں نمایاں کام کرنے والوں کو بلایا جائے اور لیکچرز اور سیمینارز وغیرہ منعقد کئے جائیں جن کے ذریعے لوگوں کے مسائل اسلام کے نقطہ نظر سے حل کئے جائیں۔مثلاً ڈاکٹرز صحت اور صفائی سے متعلق بتائیں اور ساتھ ہی یہ واضح کریں کہ ہمارے مذہب میں صحت سے کیا مراد ہے' اچھی زندگی گزارنے کے لیے اچھی صحت کا ہونا کیوں ضروری ہے۔اسی طرح بینک سے ماہرین جو کہ بلاسود کاری کاروبار کے نظام کی وضاحت کریں' کو بھی مساجد میں مدعو کیا جائے تا کہ لوگوں کے شعور میں اضافہ کیا جاسکے۔اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں ہر مسئلے کا حل موجود ہے لیکن چونکہ ہم نے مذہب کو زندگی سے بالکل الگ کر دیا ہے اس لیے ہم اپنے مذہب سے صحیح طور پر مستفید نہیں ہو سکے۔اس طرح یہ بات آہستہ آہستہ لوگوں کو سمجھ آئے گی کہ دنیا کا کوئی علم چاہے وہ طب ہو یا فن تعمیر ہمارے مذہب سے الگ نہیں ہیں۔

☆ لوگ زندگی سے متعلق اپنے اپنے تجربات دوسروں کو بتائیں اس طرح ایک طرف لوگ ایک دوسرے کی غلطیوں سے سبق سیکھیں گے اور نقصان اٹھانے سے بچیں گے اور دوسری طرف اچھے تجربات اور واقعات سے لوگوں کا ایمان اور اعتقاد بڑھے گا۔

☆ مسجد کو بنیادی عقائد کے لیے مخصوص نہ کیا جائے بلکہ ایک مسلمان ملک میں ہر مسجد ایک ایسا ''Islamic Community Centre'' ہو جہاں ایک محلے کے لوگ زندگی کے ہر مرحلہ پر اکٹھے ہوں' چاہے وہ نماز ہو یا کسی کا نکاح اور انفرادی طور پر مسلمانوں کے لیے یہ ایک درسگاہ اور پناہ گاہ ہو وہ محسوس کرے گا اور اسے کھلے دل سے خوش آمدید کہا جائے گا۔تب ہی وہ مذہب سے لگاؤ محسوس کرے گا اور اگر آغاز میں وہ آداب سے ناواقف بھی ہو تو اسے احساس شرمندگی دلانے کی بجائے پیار و محبت سے پیش آئیں۔یہ وہ وقت ہے کہ لوگ نہ صرف اسلام سے ناواقف ہیں بلکہ خوفزدہ بھی ہیں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری آنے والی نسلیں بالکل ہی غیر مذہب یا پھر کسی دوسرے مذہب کی طرف راغب نہ ہوں تو ہمیں یقیناً مسجدوں کا ماحول بدلنا ہوگا۔ایک ایک گھر کو بدلنے سے کہیں آسان ہے کہ مسجدوں میں قابل اعتماد اور پُر وقار طرز کی تبدیلی لائی جائے اور اس طرح مسلمانوں کو جدید ذرائع علم و تعلیم مہیا کئے جائیں۔

☆ _____ ☆

اسلامی تہوار

رسم ورواج دراصل وہ طریقہ کار ہوتا ہے جو کوئی قوم یا خطے کے لوگ اپنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر ملک کے رسوم ورواج پر وہاں کے مذہب کا گہرا اثر ہوتا ہے۔اس کے علاوہ اس ملک میں تعلیم کا معیار وہاں کا پس منظر وغیرہ ہر چیز ملک کے رسوم ورواج کو جنم دیتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں یعنی پاکستان میں عجیب وغریب رسوم رواج پا گئی ہیں جن کا کوئی سر پاؤں ہی نہیں اور اب یہ اندازہ لگانا ہی مشکل ہے کہ کس تہذیب کا کون سا رواج ہے جو ہماری زندگیوں کا حصہ بن چکا ہے۔

بہر حال ہم اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ان رسم ورواج نے بہت سے لوگوں کا آرام وسکون ختم کر دیا ہے۔شادی جس کا لفظی معنی ہے خوشی' ایک ایسا عذاب بن گئی ہے جو کہ نہ صرف شادی کرنے والوں پر نازل ہوتا ہے بلکہ اس عذاب کے اثرات رشتہ داروں' ہمسایوں اور دوستوں پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔یہی حال عید پر' سالگرہ پر اور عقیقہ کے موقعوں پر دیکھنے میں آتا ہے۔

دراصل رسم ورواج کی بھرمار نے ہم سب کو اتنا پریشان کر دیا ہے کہ جب بھی کسی کی شادی یا سالگرہ یا کسی بھی خوشی کے موقع کی اطلاع ملتی ہے تو ہم بجائے خوش ہونے کے اس فکر میں پڑ جاتے ہی کہ اس نے جو ہمیں دیا تھا ہمیں ہر حالت میں اس سے بڑھ کر دینا ہے اور یہ فکر ہماری ساری خوشی چھین لیتی ہے۔دل ہی دل میں ہم لعن طعن کرنا شروع کر دیتے ہیں۔اس دفعہ میں نے سوچا تھا کہ فلاں فلاں ضروری کام کرنے تھے اور اب یہ شادی مصیبت بن کر آ گئی ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ اس ساری مشکل کا کیا راز ہے اور کس طرح ہم سب مل کر اس مشکل کو آسان کر سکتے ہیں۔

رسم ورواج کی سب سے بڑی وجہ مذہب سے دوری یا پھر کم علمی ہے۔دراصل رسم ورواج تو مذہب کا حصہ ہوتے ہیں جن میں ان کی گنجائش ہوتی ہے۔ہمارا تو مذہب ہی اتنا جامع ہے کہ رسم ورواج کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی یا پھر یوں کہہ لیں کہ ساری رسوم ہمارے مذہب کا حصہ بھی تھیں لیکن ہوا یہ کہ چونکہ ہم نے مذہب کو صرف نماز' روزہ اور دوسرے بنیادی عقائد تک محدود رکھا اور یہ جانا ہی نہیں کہ اسلام تو زندگی گزارنے کا صحیح راستہ ہے اور اس راستے میں ہر قدم پر ہماری رہنمائی دلائل کے ساتھ کرتا ہے۔یہ ایک سیدھا سادہ اور جامع مذہب ہے جو انسان کو بے فائدہ مشغولیات اور فضول کاموں میں وقت' محنت اور دولت کو برباد ہونے سے بچا کر زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی طرف توجہ دلاتا ہے اور انسان کو ان کاموں کی طرف مشغول کرنا چاہتا ہے جو دنیا اور آخرت میں فلاح کا ذریعہ بنیں۔یہاں یہ بات سمجھانا ضروری ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو انسانی فطرت اور نفسیات کے عین مطابق ہے۔ہر انسان خوشی کا موقع اچھی طرح منانا چاہتا ہے۔ملنا ملانا' تحفے تحائف دینا' ہلکی پھلکی موسیقی اچھا لباس پہننا ان سب چیزوں کی نہ

صرف اسلام میں گنجائش ہے بلکہ ہمارے مذہب کا تو یہ سب حصہ ہیں البتہ اب اگر لوگوں کی خوشی ہی واہیات لباس پہننے میں، بے ہودہ موسیقی سننے اور بے جا نمود و نمائش سے ملتی ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہمارا مذہب انسانی' نفسیات کے عین مطابق نہیں ہے بلکہ یہ جان لیں کہ ہماری نفسیات ہی بگڑ چکی ہیں۔

حال ہی میں ایک ایسے انسان سے واسطہ پڑا جس کا سوال یہ تھا کہ جو لوگ ڈانس پارٹیوں میں شامل نہیں ہوتے ان کی زندگی میں ہے کیا؟ ہم تو ان چیزوں کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نفسیات ہی بگڑ چکی ہے اور خدا نے ان کے دلوں پر قفل لگا دیئے ہیں وہ تو یہ سمجھ بوجھ بھی نہیں رکھتے کہ بیہودہ حرکتیں انسان کو کس طرح خدا سے دور لے جاتی ہیں اور وہ کہیں کا نہیں رہتا۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ اس مسئلے کو کیسے حل کیا جا سکتا ہے وہ سب تہوار جو ہم مناتے ہیں اگر ہم ان کا ایک ایک کر کے جائزہ لیں کہ کس تہوار کی کیا اہمیت ہے اور کیسی تبدیلیاں لا کر ہم ان موقعوں سے حقیقی خوشی حاصل کر سکتے ہیں اور کس طرح انسانی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا جا سکتا ہے۔

شب برات

شب برات کو عموماً مسلمانوں کا تہوار سمجھا جاتا ہے۔ اس کی کچھ رسمیں بھی ہیں جن کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ نہ قرآن میں اس تہوار کی کوئی اصلیت ہے اور نہ حدیث میں صحابہ اکرامؓ کے دور کی تاریخ میں بھی اس تہوار کا کوئی نشان نہیں ملتا اور نہ ہی ابتدائی دور کے بزرگان دین نے اس تہوار کو اسلامی تہوار قرار دیا ہے۔

ذرا غور کریں تو صاف ظاہر ہوگا کہ ہماری تہذیب کا ایسی فضولیات سے واسطہ ہو ہی نہیں سکتا جس میں حلوے پکانے اور آتش بازیاں چھوڑنے کے سوا کچھ نہ ہو اور لوگوں کو یہ ترغیب دی جائے کہ مستقل طور پر ہر سال اپنی زندگی کے چند قیمتی گھنٹے اور اپنی محنت سے کمائے ہوئے بہت سے پیسے ضائع کریں۔

اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ ایسی رسم کا انسان کو پابند کیا جائے جو نہ صرف وقت اور پیسہ برباد کرتی ہے بلکہ بعض اوقات تو یہ کتنی قیمتی جانوں کو ضائع کر دیتی ہے اور گھر تک پھونک ڈالتی ہے۔ اس قسم کی فضولیات کا حکم دینا تو درکنار اگر ایسی رسمیں نبی پاک ﷺ کے زمانے میں ہوتیں تو ان سے فوراً روک دیا جاتا کیونکہ اس طرح کی جو دوسری رسمیں اس دور میں رائج تھیں ان پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ اگر ہم اس تہوار کا جواز تلاش کریں تو زیادہ سے زیادہ اگر کوئی چیز اسلامی لٹریچر میں ملتی ہے تو وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ شعبان کی پندرھویں شب حضرت عائشہؓ آنحضرت ﷺ کو بستر پہ نہ پا کر ان کی تلاش میں بقیع کے قبرستان پہنچیں تو آپ ﷺ کو وہاں موجود پایا۔ وجہ دریافت کرنے پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس رات کو اللہ تعالیٰ آسمان سے دنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور گناہ معاف فرماتا ہے۔ لیکن حدیث کے مشہور امام ترمذی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔

اس بارے میں جتنی روایات اور احادیث سامنے آئی ہیں ان میں کوئی نہ کوئی کمزوری موجود ہے۔ تاہم اگر اس کی اصلیت کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو محض یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس رات میں عبادت کرنا اور مغفرت کی دعا کرنا ایک بہت ہی اچھا فعل ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ کیا جائے وہ لغو اور بے معنی ہوگا۔

عید میلاد النبی ﷺ

یہ بات طے شدہ ہے کہ نبی پاک ﷺ نے نہ تو اپنی حیاتِ مبارکہ میں یوم عید میلاد النبی ﷺ منایا اور نہ ہی اس کا حکم صادر فرمایا۔ اس طرح خلفائے راشدین اور جملہ صحابہ کرامؓ نے بھی اس کا اہتمام نہیں کیا۔ جبکہ وہ لوگ آپ کی سنت کے سب سے بڑے غلام اور سب سے بڑھ کر ان سے محبت کرنے والے اور شریعت پر عمل کرنے والے تھے اور آج ہم بے راہ روی کے دور سے گزر رہے ہیں۔ ہمیں تو یہ دن اللہ تعالیٰ کے عذاب کے خوف اور اپنے اعمال پر شرمندگی سے روتے ہوئے گزارنا چاہیئے۔ کیونکہ ہمارے کتنے اعمال ہیں جو حضور پاک ﷺ کی سنت سے مطابقت رکھتے ہیں؟ ہمیں سب کچھ سکھانے کے لیے حضور اکرم ﷺ نے ہر قدم پر عملاً نمونہ پیش کیا تا کہ کوئی یہ جواز نہ ڈھونڈ سکے کہ عام انسان یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔ ہمارے نبی پاک ﷺ ایک عام انسان کی طرح تکلیفیں اٹھاتے رہے اور ہمیں سکھاتے رہے اور آج یہ حال ہے کہ اگر کوئی آپ ﷺ کی محبت سے سرشار ہو کر آپ ﷺ کی سنت کے مطابق حلیہ بھی رکھنا چاہے تو (نعوذ باللہ) اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو نوکری سے نکال دیا جاتا ہے۔

حال ہی میں ایک ایسا واقع پیش آیا کہ ایک خاتون ہمارے ہاں تشریف لائیں اس کے بیٹے کا مسئلہ یہ تھا کہ اس نے اپنا ہر عمل سنت و حدیث کے مطابق کر لیا ہے جس وجہ سے اس کی نوکری چلی گئی ہے اور اب اس کو یہ ڈر ہے کہ اس کی منگنی بھی ٹوٹنے والی ہے اور ہوا بھی ایسے ہی۔ لڑکی والوں نے یہ کہہ کر منگنی توڑ دی کہ لڑکا بہت نیک اور اچھا ہے لیکن ہمیں اتنا اچھا لڑکا نہیں چاہیئے۔

بس اتنی ہی محبت ہمیں حضور اکرم ﷺ سے ہے کہ جو آپ ﷺ کی سنت کو اپنائے اسے ہم رد کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اپنی سوچ بدلنا ہوگی اور صحیح اور غلط کی پہچان کرنا ہوگی اور یہ سب تہوار منانے سے نہیں بلکہ صحیح علم حاصل کرنے سے تا کہ ہم میں وہ جذبہ پیدا ہو سکے کہ ہم صحیح بات پر ڈٹے رہیں چاہے اس کی کتنی ہی قیمت ہمیں ادا کیوں نہ کرنی پڑے۔

عید الفطر اور عید الاضحیٰ

جہاں تک ان دو تہواروں کا تعلق ہے شرعی حدود میں رہتے ہوئے ان کو بھرپور انداز میں منانا چاہیئے۔ خوشی کے

اظہار کا ایک اہم حصہ کھانا پینا وغیرہ بھی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

'' ایامِ تشریق کھانے' پینے اور ذکر الٰہی کے دن ہیں۔ '' (شرح معانی الاثار)

ایامِ تشریق سے مراد عید الاضحیٰ کے بعد تین دن ہیں۔ اسی طرح تحفے تحائف دینا بھی شریعت کے عین مطابق ہے ۔دعوت پر بلانا یا پھر کسی کی دعوت پر جانا بھی جائز ہے۔ لیکن اس سب کے دوران غریب رشتے داروں ہمسائیوں اور ضرورت مندوں کو نظر انداز کرنا نہایت غلط ہے۔ ہمارے ہاں عیدی دینے کی رسم سودے بازی کی صورت اختیار کر چکی ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے ہزاروں روپوں کی صورت میں عیدی اکٹھی کر کے ایک دوسرے کو بتاتے پھرتے ہیں کہ ہماری عیدی کتنی ہوئی جس سے بچوں کو ایک طرف مقابلے بازی کی عادت پڑتی ہے اور دوسری طرف وہ ہر وقت اس انتظار میں رہتے ہیں کہ مہمان آیا ہے تو عید دے کر جائے یا پھر کسی کے گھر جانا ہو تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ادھر چلیں جہاں عیدی کی زیادہ امید ہو۔ اپنی جیب سے تو وہ کسی کو دے نہیں رہے ہوتے بس جمع کرتے چلے جاتے ہیں اور ماں باپ اتارتے چلے جاتے ہیں اور یہ سودے بازی برابر کی حیثیت کے لوگوں میں جاری رہتی ہے۔ نئے نئے نوٹوں کا بازار گرم ہوتا ہے اور اس لین دین کے چکر میں اصلی حقدار منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ تو زکوٰۃ کے حقدار ہوتے ہیں لیکن بہت سے لوگ زکواۃ کے حقدار نہ ہونے کے باوجود مستحق ہوتے ہیں۔ بے شمار لوگ سفید پوشی کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ انہیں تلاش کریں اور عید میں ان کے ساتھ شامل ہوں۔ آج جو ہمارے بچے کرتے ہیں وہ ہماری ہی لاپرواہی کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم چاہیں تو بچوں کو بڑی آسانی سے سمجھا سکتے ہیں کہ عید کے بارے میں وہ اپنا رویہ بدلیں اور لینے کے ساتھ ساتھ دینے کی عادت ڈالیں۔ عیدی لینے سے جو خوشی ہوتی ہے وہ تو ہوتی ہی ہے لیکن عید دینے سے جو بچوں میں عزت نفس بڑھے گی وہ انہیں اچھا انسان بننے کا احساس دلائے گی اور ان میں خود اعتمادی پیدا ہوگی اور اس طرح ہم خدا کے آگے سرخرو ہوں گے۔

☆ ☆